ص۱۶۶ اکثریت ص۱۹۹ برادری ص۲۲۲ تجارت ص۲۴۴ نظر ص۲۸۱ شخصیتوں ص۲۸۳ جلا ص۲۹۴ روشن ص۲۹۵ وغیرہ مونث ہیں لیکن ان کو مذکر لکھا ہے، موطا، مسند احمد اور ہدایہ کو بھی مذکر لکھ گئے ہیں، خصوصیات ص۱۵۵، علوم و فنون ص۱۵۰، اشعار ص۱۶۳، سوانح ص۲۵۴، عنوانات ص۲۷۱، مشکلات ص۲۹۰، علل و اسباب ص۳۰۰، تفردات و نوادرات ص۴۴۵ وغیرہ جمع ہیں لیکن مصنف کی تحریر میں واحد استعمال ہوئے ہیں، اور طبقہ ص۱۰۲ اور بیان ص۲۴۵ واحد ہیں، مگر جمع استعمال کئے گئے ہیں، نوادرات، شروحات اور سندات وغیرہ بے تکلف لکھ گئے ہیں، قلع قمع، طول طویل، عرض معروض اور حیص بیص وغیرہ بلا واو استعمال ہوتے ہیں، مگر مصنف نے واؤ کے ساتھ استعمال کیا ہے، معطوف اور معطوف علیہ میں یکسانیت کا لحاظ نہیں کیا گیا، ہے، جیسے محبت و سعادتوں ص۶ روابط و تعلق ص۹ میں ایک مفرد اور دوسرا جمع ہے اسی طرح آفتاب و قمر میں ایک فارسی اور دوسرا عربی ہے، بعض جملوں میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر کا خیال نہیں رکھا گیا ہے، جیسے ایک سادات خاندان ص۳۹، دارالعلوم کے بعض صدارت تدریس کے عہد (ص۱۶۶) بعض اس کی جزئیات (ص۲۲۲) مندرجہ ذیل جملوں میں خط کشیدہ الفاظ زائد اور بلا ضرورت ہیں، جیسے ملاقات کے بعد میں فرمایا ص۱۴۳، صوفیا سے ایک غیر معمولی عقیدت تھی (ص۱۶۳) ایک جگہ لکھا ہے اشعار موضوع فرماتے ص۲۶۹ اشعار موزوں کئے جاتے ہیں، شاہ صاحب نے اپنے بھولے کے انداز میں فرمایا ص۴۲ یہ علمی زبان نہیں ہے، سنجی جسم نان بان بلکہ مرزا پھویا ص۳۷ نان بان کے بجائے دھان پان استعمال ہوتا ہے، نذر قارئین کو ہر جگہ نظر قارئین اور نفحی مکاتب کو فقہی مکاتیب لکھا ہے، شعاعوں کا املا شعاؤں (ص۲۳۳) اور مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کو نظیر حسین ص۳۵ لکھا ہے، اس طرح کی غلطیاں اور بھی ہیں، مصنف ایک مشاق اہل قلم ہیں، یہ بے احتیاطی کسی طرح انکے شایان شان نہیں،

(ض)

جلد ۱۲۴ ماہ محرم الحرام ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۹ء عدد ۶

مضامین

شذرات

۹ر اور ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے جلسے بہت ہی خوشگوار فضا میں منعقد ہوئے، اس کے معزز ارکان نے اُس کے علمی کاموں کا خاطر خواہ جائزہ لیا اور اس کی دیرینہ روایات کے مطابق اُس کی آیندہ علمی سرگرمیوں کے لئے مفید اور حوصلہ افزا مشورے دیئے،

اس سال ان کے سامنے چار نئی مطبوعہ کتابیں غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد دوم "تذکرۃ المحدثین" جلد دوم، مرزا مظہر جانجاناں، اور تبع تابعین جلد دوم پیش کی گئیں، خاکسار کی روداد پر ارکان نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی میں آیندہ پانچ سال میں حسب ذیل کتابوں کی ترتیب و تدوین کی منظوری دی،

(۱) اسلام کا نظریہ حکومت (۲-۳) تاریخ ہند جلد اول و دوم (۴) امیر خسرو بحیثیت صوفی (۵) عہد مغلیہ میں مذہبی رواداری (۶) سیرۃ النبیؐ کی چھ جلدوں کا خلاصہ (۷) تذکرۃ المحدثین جلد سوم (۸) تذکرۃ الفقہاء (۹) فقہائے ہند (۱۰) مفکرین اسلام (۱۱) سیرۃ عائشہؓ کا عربی ترجمہ (۱۲) شیخ مصطفٰے الزرقاء کی المدخل الفقہی العام کا اردو ترجمہ"

"اسلام کا نظریہ حکومت" استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اس نامکمل مسودہ پر مشتمل ہوگی، جو سیرۃ النبی جلد ہفتم کے لئے تیار کیا جارہا تھا، اب اس کا نام یہی ہوگا، کیونکہ سیرۃ النبی جلد ہفتم کے پورے مباحث مکمل نہیں ہوسکے، ہندوستان کے مسلمانوں کے دورِ حکومت کی تاریخ کو دو جلدوں میں اس طرح ترتیب دینے کا مشورہ دیا گیا ہے کہ ان میں ایسی معروضیت اور حقیقت پسندی ہو کہ یہ قارئین کے ذہن کی تشنگی کو فرو کرسکیں، بعض حلقوں میں یہ شکوک ظاہر کئے جارہے ہیں کہ حضرت امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے باضابطہ مرید تھے کہ نہیں، "امیر خسروؒ بحیثیت صوفی" میں اس مسئلہ پر مدلل بحث کرکے ان کا عارفانہ مقام دکھایا جائے گا، عہد مغلیہ میں مذہبی رواداری میں ان شکوک کا ازالہ کیا جائیگا، جو بعض مورخوں نے خواہ مخواہ پیدا کردیئے ہیں،

سیرۃ النبی کی چھ جلدوں کے خلاصہ کی طلب عرصہ سے کیجارہی تھی، اس کی اشاعت ہر لحاظ سے مفید ہوگی، تذکرۃ المحدثین جلد سوم میں ہندوستان کے محدثین کے حالات ہوں گے، تذکرۃ الفقہاء میں ایسے فقیہوں کا ذکر ہوگا، جنھوں نے فقہی مسائل کے حل کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، فقہائے ہند میں ہندوستان میں فقہی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے گا، مفکرین اسلام میں ان افکار و خیالات پر مباحث ہوں گے جن سے اسلامی ممالک کی مذہبی تحریکات متاثر ہوئیں، شیخ مصطفٰے الزرقا کی کتاب کے ترجمہ کی ہدایت اور اس کی جلد از جلد اشاعت کی تاکید مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے خاص طور پر کی ہے، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مشہور تصنیف سیرۃ عائشہؓ کا ترجمہ مولانا محمد ناظم ندوی نے کیا ہے، جو عربی زبان کے ممتاز ادیب سمجھے جاتے ہیں، اس کے عربی ترجمے سے اسلامی ممالک کے اہلِ علم بھی مستفید ہوں گے،

جلسہ کے بعد اس خاکسار کی گذارش پر جناب الحاج عبدالرحمٰن خاں شروانی نے مزید چھ روز قیام کرنے کی زحمت گوارا کی، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے خازن کی حیثیت سے اُن کی شہرت پورے ہندوستان میں ہے، انھوں نے مالیات کی اپنی دیدہ وری سے دار المصنفین کے حساب کتاب کا بڑا تنقیدی جائزہ لیا، اس سے مطمئن ہوکر بہت سے مفید مشوروں سے نوازا جس کے لئے ہم اُن کے بے حد ممنون ہوئے،

ان ہی دنوں علامہ شبلی نعمانیؒ میموریل لکچر کا ایک توسیعی خطبہ ڈاکٹر نذیر احمد ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں دیا، عنوان "مولانا شبلی اور فارسی زبان و ادب کی خدمت" تھا، ڈاکٹر صاحب موصوف فارسی زبان و ادب میں اپنی بالغ نظری کے لئے اس برصغیر سے باہر کے ممالک میں بھی مشہور ہیں، ان کا خطبہ ایک منتخب مجمع میں بہت ہی شوق اور توجہ سے سنا گیا، علامہ شبلی نے شعر العجم میں ایران میں شاعری کیونکر پیدا ہوئی، فارسی شاعری پر تفصیلی ریویو، قصیدہ گوئی، عشقیہ شاعری، غزل گوئی، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری وغیرہ پر جو کچھ لکھا ہے اس کو ڈاکٹر صاحب نے فنِ تنقید نگاری کا ایک بلند پایہ نمونہ قرار دیا، اور بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ علامہ کی فارسی نظمیں ایران کے کسی بھی ممتاز شاعر کی نظموں کے

برابر قرار دی جاسکتی ہیں، خطبہ طویل تھا اس کا دلچسپ خلاصہ ایک گھنٹہ میں ختم ہوا جس کے بعد مباحثہ میں یہ ظاہر کیا گیا کہ علامہ شبلی نے امیر خسرو، فیضی، نظیری، عرفی، کلیم اور صائب پر جو کچھ لکھ دیا ہے اسی کے ایجاز کا اطناب موجودہ دور میں ہو رہا ہے، پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی تنقیدات شعر العجم بھی زیر بحث آئی، آخر میں مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر یہ بتایا کہ جناب محمود شیرانی مرحوم اپنی نجی صحبت میں علامہ شبلی کے علم و فضل کا ذکر احترام سے کرتے تھے،

روحِ اقبال، اور اردو غزل کے مشہور مصنّف ڈاکٹر یوسف حسین دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بہت ہی مخلص رکن ہیں، وہ اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے اس کے جلسہ میں تو شریک نہیں ہوئے، لیکن برابر اپنے مخلصانہ مشوروں سے مستفید فرماتے رہتے ہیں، انھوں نے اپنے ذاتی کتبخانہ سے کلام پاک کے دو بہت ہی قیمتی اور دیدہ زیب نسخے دار المصنفین کو عطا کئے ہیں، ایک تو وہ نسخہ ہے جو شاہ ایران کی فرمایش پر چاپخانہ بانک ملی ایران میں طبع ہوا، اور اس کا ایک نسخہ شاہ ایران نے ڈاکٹر صاحب کو نذر کیا تھا، دوسرا نسخہ وہ ہے جو علی خطاطی کے ساتھ مصر میں چھپا، ان دونوں نسخوں سے دار المصنفین کے ذخیروں میں بہت ہی مفید اضافہ ہو گیا ہے، ان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے کچھ اور کتابیں بھی نذر کی ہیں، دار المصنفین ان کی اس فراخدلانہ پیشکش پر اُن کا شکریہ ادا کرتا ہے،

یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں کہ ڈاکٹر عابد حسین کے انتقال پر ملال کی خبر ملی، وہ جامعہ ملیہ کے جاں نثار، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے رفیق قلبی، ایک بہت بڑے محب وطن، ایک قابلِ قدر فلسفی، اردو زبان کے با یۂ ناز ادیب، ایک ماہر مترجم، ایک بلند پایہ مصنف، ایک محتاط اہلِ قلم، اسلام اور عصرِ جدید، پھر انگریزی رسالہ موڈرن اسلام کے صاحبِ ل اڈیٹر اور انسانی اخلاق کے بعض دلآویز اوصاف کے حامل کی حیثیت سے اپنے ہم وطنوں، معاصروں اور قدر دانوں میں برابر یاد کئے جائیں گے، دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اُنکو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا فرمائیں، معارف کی آیندہ اشاعت میں اُن کی خوبیوں پر ایک مفصل مضمون شائع ہوگا،

مقالات

اسلامی ریاست کی اوّلین بنیاد

نظریۂ خلافت

از مولانا سید سلیمان ندویؒ،

معانی جن الفاظ سے ادا کئے جاتے ہیں، اگر اونکی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہوگا کہ ان الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اس کی اپنی طرزِ حکومت کے فرد عامل کا نام خلیفہ اور اس کی اس طرزِ حکومت کا نام خلافت ہے، خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں، اوس کے صاف معنی یہ ہوے کہ وہ خود حاکم و فرمانروا نہیں بلکہ وہ اس حکومت اور فرمانروائی میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت اور قائم مقامی کرتا ہے،؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں میں مذکور ہے، مگر دونوں کے نتیجے مختلف ہیں، تورات میں یہ بیان صرف آغاز پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے، لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے، اسلام میں انسان کا مکلف ہونا،

اس کا اصلی مقام بہشت ہونا، جزا و سزا کا راز، رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اسی قصہ سے ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین، دنیا میں اس کے فرائض اور احکام الٰہی کی بجا آوری کی صورت اور مخلوقات الٰہی کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے، پہلی چیز اسلام کے دینیات کے اساسی عقائد ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہے[1]

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ادا ہوا ہے،

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (بقرہ ۴-۳)

اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے، جو تمام بنی آدم کے قائم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے، اسی لئے دوسرے موقعوں پر صرف آدمؑ کے بجائے سارے بنی آدم اس شرف سے مخاطب ہیں، چنانچہ فرمایا،

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا، (بنی اسرائیل-۷)

ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی،

---

[1] خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خیالات ادھر رجوع ہوئے، خاکسار نے سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اسکی تصریح کی گئی ہے یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے،

اور اسی لیے آدمؑ بنی آدم کے قائم مقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغۂ جمع استعمال فرمایا ہے،

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ ۴)

تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ، اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ رہنمائی آئے تو جو میری رہنمائی کی پیروی کریں گے تو ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔

سورہ اعراف میں ارشاد الٰہی ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ، (اعراف-۲)

اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمھارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے، تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا، پھر تمھاری صورتیں بنائیں، پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے کہ وہ سجدہ کرنیوالوں میں نہ تھا،

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو سرفرازی ملی وہ نسلی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی، اس لئے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی، سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے،

وَهُوَ الَّذِی جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ
فِی الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ
فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَ
كُمْ فِی مَآ اٰتٰكُمْ اِنَّ رَبَّكَ
سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ
لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (انعام ۲۰)

اور وہی (خدا) وہ ہے جس نے تم
(انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا
اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے
پر درجہ بڑھایا، تاکہ تمکو جو دیا اس میں
تمکو آزمائے، بیشک تیرا پروردگار جلد
سزا دینے والا ہے، اور وہ بے شبہ* بخشنے والا مہربان ہے

یہاں پہونچکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے، قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت کی جانشینی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم حضرت نوحؑ کی قوم کا جانشین، فرمایا۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ
مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (اعراف ۹)

اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوحؑ کے
بعد جانشینی بخشی،

اور پھر ثمود کو عاد کا جانشین بنایا۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ
مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (اعراف ۱۰)

اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد
نیابت بخشی،

حضرت ہودؑ اپنی قوم عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالےٰ کی فرمانبرداری نہ کی

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ
(ہود ۵)

تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور
قوم کو خلافت بخشے گا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ارشاد ہوا،

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ

اور خدا چاہے گا تو تم کو لے جائے گا۔

مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ
اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ
اٰخَرِيْنَ (انعام ۱۶)

اور تمہارے بعد جس کو چاہے خلافت
و نیابت دے، جس طرح تم کو دوسرے
لوگوں کی نسل سے پیدا کیا،

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ
فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور ۷)

اللہ نے تم میں سے ان سے جو ایمان
لائے اور اچھے کام کئے، وعدہ کیا کہ
ان کو زمین میں خلافت بخشے گا جس طرح
تم سے پہلوں کو خلافت بخشی،

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا،

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ
الْاَرْضِ۔ (انعام ۱۹)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین کے
جانشین بنائے۔

سورہ یونسؑ میں تصریح ہے،

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا
لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِی
الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ
خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ

اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو جب
انھوں نے ظلم اختیار کیا، ہلاک کر چکے
ہیں، اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں
لے کر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان
لاتے، ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح
بدلہ دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے ان کے

بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (یونس - ۲۰)
بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ (یونس - ۸)
لیکن ان لوگوں نے ان (نوحؑ) کی تکذیب کی تو ہم نے ان کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو (طوفان سے) بچالیا اور انھیں (زمین میں) خلیفہ بنادیا۔

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ - (۴)
وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا، تو جس نے کفر کیا اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے،

حضرت داؤدؑ کو خلافت بخشی گئی۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص - ۱)
اے داؤدؑ ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔

اس لفظ خلیفہ کا اشتقاق خَلْفٌ سے ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے ایک کی غیر موجودگی میں خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیوبت کے سبب سے ہو یا آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں اس کی طرف سے اس کے پیچھے میں جو کوئی نمائندہ ہو

ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے، قرآن پاک میں ہے،

۱- فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ (اعراف - ۲۱ و مواضع)
تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔

یہ موت کے بعد کی جانشینی ہے، دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا۔

۲- اُخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ (اعراف ۱۷)
میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو

۳- وَلَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰۗىِٕكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ (زخرف)
اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔

ان آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے، پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، اور تیسری آیت میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تمھاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمھارے جانشین ہوتے دوسروں نے کہا کہ تمھاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا، اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمھاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین ہوتے چلے جاتے،

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں،

الخلافة النيابة عن الغير اما لغيبة المنوب عنه واما لموته واما لعجزه
خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں، اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو یا اس کی

واما التشریف المستخلف	موت کی سبب سے ہو یا اس کے اپنے
(ص ۱۵۵ مصر)	منصب سے عاجز ہونے کے سبب سو
	ہو یا نائب کو نیابت کی عزت بخشنے کیلئے ہو

پھر متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ کی نیابت کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، مفتی آلوسی زادہ صاحب روح المعانی تک ہر موقع پر جس میں یہ لفظ آیا ہے، تینوں معنوں کے مختلف قول لکھتے ہیں، اور کوئی ایسی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے، جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں کون سے معنی لینے چاہئیں، میرے دل میں یہ بات آتی ہے کہ روزمرہ کا عام محاورہ یہی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو وہی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہو گا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود اسی متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہو گی، اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے، اسی کی جانشینی مراد ہو گی، اور جہاں تصریح نہیں ہے، وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالےٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہو گی جیسے قرآن پاک میں ایک جگہ آیت ہے۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ	اور خرچ کرو اس (مال) میں سے
فِيْهِ - (حدید ۱)	جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہو

اب اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لئے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں، ایک نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے، دوسرے نے یہ کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے، اس کو امانۃً اپنا نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے

امور خیر میں اس کو صرف کرے میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے، کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں، کشاف وبیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے، کشاف میں ہے یعنی، ان الاموال التی فی ایدیکم انما هی اموال اللہ بخلقه وانشائه لها وانما مولکم ایاها وخولکم الاستمتاع بها وَجَعَلَكُم خلفاء فی التصرف فیها، بیضاوی میں ہے، من الاموال التی جعلکم اللہ خلفاء فی التصرف فیها۔

روح المعانی میں ہے۔

جعلکم سبحانه خلفاء عنه	اللہ تعالےٰ نے تم لوگوں کو اپنا اس
عز وجل فی التصرف فیه	(مال) کے تصرف میں جانشین بنایا
من غیر ان تملکوه حقیقة	ہے نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو،

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں،

اب ہم اس اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس باب میں سرعنوان ہے یعنی

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ	اور جب تیرے رب نے فرشتوں
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ	سے کہا کہ میں زمین میں ایک
جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ	خلیفہ بنانے والا ہوں
خَلِيْفَةً۔ (بقرہ-۴)	

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے انہیں سابقہ دونوں معنوں کو تعمیم کے ساتھ یکے بعد دیگر

لکھ دیا ہے، اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے، طبری میں بھی یہ دونوں قول ہیں ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرے یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرمایا ہو، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کا حوالہ دیکر لکھا ہے،

اِنّی جَاعِلٌ فِی الارضِ خَلِیفَۃً	میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ
منّی یَخلُفنی فی الحکم بَینَ	بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا،
خَلقِی۔	میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا ایک مطلب یہ بیان کیا ہے۔

اِنَّ اللہ تعالٰے اخبر الملٰئکۃ	اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے
اِنّہ جَاعِلٌ فِی الارضِ خَلِیفَۃً	کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے
لَہٗ یحکُمُ فیھا بَینَ خَلقِہٖ	جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات
بِحُکمِہٖ (ص ۱۲۴ مصر)	میں فیصلہ یا حکومت کریگا۔

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے،

والمراد بہ آدم علیہ السلام	اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں،
لانہ کان خلیفۃ اللہ تعالٰے	کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالےٰ
فی ارضہ وکذالک کل نبی	کے خلیفہ تھے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے
استخلفھم فی عمارۃ	ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی
الارض وسیاسۃ الناس	اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی
وتکمیل نفوسھم وتنفیذ	تکمیل اور اللہ تعالےٰ کے احکام نافذ

(الواو)

امرہٖ فیھم لاحاجۃ بہٖ	کرنے میں، اللہ تعالےٰ اس کا محتاج
تعالٰے الی من ینوبہ بل لقصور	نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس
قبضہ وتلقی امرہ بغیرہ	وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تلقی
بغیر وسط	کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی

لیکن قرآن پاک کی دوسری آیتوں سے جو بھی اوپر گذر چکیں اور جن میں اللہ تعالےٰ نے سارے بنی آدم کو خلفاء فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان انبیاء کے توسط سے اس خلافت الٰہی کی سند انبیاء علیہم السلام کے متبوعین تک کو عطا ہوئی ہے، اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں،

اس آیت خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہو رہی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں،

۱۔ تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو بھی لکھا ہے،

۲۔ روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالےٰ ایک مخلوق کے بعد … دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا، آدمؑ کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن جس اہتمام سے جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدمؑ کی پیدائش اور نیابت اور فرشتوں کے سجدہ اور جنت کے داخلہ اور پھر اس کی عدول حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلہ انبیاء قائم کرنے وغیرہ کے فضائل وخصائص سے ان میں کوئی ممتاز نہیں ہوا، یہ اہتمام ہی اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گذشتہ مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی تھی،

۳۔ اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھکر جو اصول ممہد کیا گیا ہے، اور جس کا منشا یہ ہے کہ اصول کلام یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی اس میں اسی مذکور کی

نیابت سمجھی جائے گی، اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی، جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا، اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے، یا سیاق وسباق سے مفہوم ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی اور اگر اس توضیح سے کلام کلیۃً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے، اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے، جس کا آدم کو نائب بنانا سمجھا جائے، ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا متعین ہوجائیگا،

۲- اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں جن سے آدمؑ اور بنی آدم کے شرف کرامت کا اظہار ہوتا ہے، فرمایا،

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل ۔۷)

ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں اٹھائے ہیں، اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔

دوسری آیت میں فرمایا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (تین ۔۱)

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

پھر فضائے آسمانی سے زمین تک جو کچھ ہے اس کے لئے بنا ہے اور اس کے کام میں لگا ہے،

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ

اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (جاثیہ ۲)

اپنی طرف سے مسخر بنایا بیشک اس میں ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں جو سوچتے ہیں

اور یہی نیابت الٰہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں مقامات میں مخلوقات الٰہی کو انسان کا تابعدار اور مسخر اور انسانوں کے لئے اُسکا بنایا جانا بتفصیل مذکور ہے، مزید تشریح کے لیے چند آیتیں یہاں بھی لکھی جاتی ہیں۔

خلق لکم ما فی الارض جمیعا (بقرہ ۳) — اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا،

وهو الذی سخر البحر (نحل ۲) — اور وہی تو ہے جس نے دریا کو (تمھارے) اختیار میں کیا

اللّٰہ الذی سخر لکم البحر (جاثیہ ۲) — اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کردیا

وسخر لکم الفلک (ابراہیم ۵) — اور کشتیوں (اور جہازوں) کو تمھارے زیر فرمان کردیا

وسخر لکم الانہار (ابراہیم ۵) — اور نہروں کو بھی تمھارے زیر فرمان کیا۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود اصلی ہے اور اس کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے، اور یہی خلافت الٰہی کا منشا ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے،

انا عرضنا الامانة علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها وحملها الانسان انه کان ظلوما جهولا (احزاب ۹)

ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انھوں نے اسکے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا، بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت الٰہی کے بار کا اٹھانیوالا انسان ہی ہے، یہ امانت الٰہی کیا ہے، یہ اسی نیابت وخلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے،

نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے جو اس کو ملی ہے، تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے، اس کا علم و فضل و کمال اور دوسرے کمالات علمی و عملی اور محاسن و اوصاف سب اللہ تعالے کی طرف راجع ہیں، اور اسی کے خزانے سے چند روز کے لئے عاریت ملے ہوئے ہیں، یہ حدیث کہ فانّ اللّٰہ خلق آدم علی صورتہ (اللہ تعالے نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے) اسی معنی کی طرف مشیر ہے اور مشہور قول تخلقوا باخلاق اللّٰہ (اللہ کے اخلاق سے متصف ہو) کی تشریح بھی یہی ہے،

اس تفصیل سے واضح ہو گا کہ اسلام کا نظریہ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصوّر پر مبنی ہے جو انسانیت کے تخیل کو بلند سے بلند نقطہ تک پہونچاتا ہے، اور جس کے اندر مادی و روحانی خالص سیاسی اور اخلاقی، دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریباں ہیں،

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتا دی ہے، وما خلقتُ الجنَّ والانس الا لیعبدُون (میں نے انسان اور جن کو اسی لئے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں) اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے، جس کا فرض اپنے نہیں صرف مالک کے احکام کی تنفیذ ہے، اس کے ہاتھ میں شریعت الٰہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجا لانا اور ساری دنیا کو اس کے بجا لانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے، وہ اپنی نہیں بلکہ صرف مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

مرزا احسان احمد کی یاد میں

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

جناب مرزا احسان احمد کی وفات کو چھ سال گزر گئے، ان کی وفات ۳۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ہوئی، مگر وہ یاد آتے ہیں، اور اکثر یاد آتے ہیں، دار المصنفین کے قدر داں، مجلس انتظامیہ اور مجلس عاملہ کے معزز رکن کی حیثیت سے برابر یاد آئیں گے اپنی رکنیت سے پہلے بھی ہر موقع پر اس سے اپنی محبت، یگانگت اور موانست کا ثبوت دیتے رہے، اسی جذبہ کی وجہ سے وہ یہاں تقریباً ۵۰ سال تک برابر آتے رہے، اس کے پھاٹک میں داخل ہوتے تو اپنی شیروانی اور اسی کپڑے کی کشتی نما ٹوپی پہنے اور ہاتھ میں چھڑی لئے ہوئے نمودار ہوتے، ۵۰ سال تک ایک ہی رفتار میں دیکھے گئے، جس میں سنجیدگی بھی ہوتی، اور وقار بھی، پھاٹک میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف مڑ کر مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کے دفتر میں پہونچ جاتے، تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ کر استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے کمرے میں چلے آتے، وہاں سے اٹھ کر دار المصنفین کے رفقاء سے ان کے علحدہ علحدہ کمروں میں جا کر ملتے اس طرح سب سے مل ملا کر خراماں خراماں رخصت ہو جاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ اپنی محبت اور بھلمناہت کی خوشبو دار المصنفین کی فضا میں چھڑک کر اور خود معطر ہو کر چلے گئے، وہ زیادہ گفتگو کرنے کے

عادی نہ تھے لوگوں سے کم اور سنتے زیادہ ، کسی بات سے خوش ہو جاتے تو ایک خاص قسم کی ہنسی ہنستے ، دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا کہ یہ ہنسی ان کی آنکھوں میں بھی منتقل ہوگئی ہے جس سے ان کے چہرے پر رونق آجاتی ، وہ بولتے کم تھے ، اس لئے غیبت ، دل آزاری اور دل شکنی کی باتیں ان کی زبان سے نہیں نکلتیں ، نصف صدی سے زیادہ دارالمصنفین والوں سے ان کے تعلقات رہے ، لیکن ان میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے کسی موقع پر بھی کوئی ایسی بات کہی جو انکو نہ کہنا چاہئے تھا ، انھوں نے جگر کی وفات پر ماتم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "انھوں نے آئینۂ حیات کو بغض وعناد ، رشک وحسد ، غرور وتمکنت سے کبھی غبار آلود ہونے نہیں دیا ، وہ کسی انسان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ نہیں سکتے تھے "یہی بات ان کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے ، جس کی تردید نہیں ہوسکتی ہے ۔

وہ اعظم گڈھ کے ممتاز اور مشہور وکیل تھے ، لیکن ان کی وکالت میں بڑی وضعداری اور خودداری تھی ، رات کے وقت موکل سے نہیں ملتے ، کچہری جانے سے پہلے موکلوں کے کاغذات دیکھ لیتے ، پھر عدالت کے قضیے کو عدالت کے کمرہ ہی میں چکاکر بے نیاز ہوجاتے ، گھر آتے تو بھی کچہری کا کوئی فکر ہی نہیں آنے دیتے انھوں نے اپنی قابل قدر خودداری اور وضعداری سے اس پیشہ بلکہ اپنی زندگی کے مطمح نظر کو سود وزیاں سے بالاتر رکھا تھا ، خود کہہ گئے ہیں ،

جس کو ہو ہر گام پر اندیشۂ سود وزیاں ایسی عقلِ مصلحت بیں کو تو احساں پھونک دے

ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں ۔

تیری خودداری پہ قربان دولتِ ارض وسما یہ رہے قائم تو پھر کیا تجھ کو احساں چاہئے

بڑے اچھے شاعر ، بڑے اچھے نثرنگار اور بڑے اچھے نقاد تھے ، ان تینوں فن میں ان کا شمار اصحابِ کمال میں کیا جاسکتا ہے ، لیکن وہ خود کبھی اپنے فن کی مہارت کے دعویدار

نہیں ہوئے اور نہ توقع رکھی کہ وہ ادبی اور علمی مقام ملنا چاہئے ، جس کے وہ واقعی مستحق ہیں ، بہت ہی اصرار اور تقاضا کے بعد کسی کو اپنا کلام سناتے ، جوانی میں کچھ دنوں اپنے گھر پر مخصوص شاعروں کو جمع کر کے طرحی مشاعرے سے لطف اٹھاتے رہے ، لیکن بعد میں مشاعرے میں شریک ہوکر اپنے ذہنی سکون اور جسمانی راحت میں خلل ڈالنا پسند نہ کرتے ، اعظم گڈھ میں ان کی زندگی میں بڑے بڑے مشاعرے ہوئے ، ہندوستان کا شاید ہی کوئی بڑا شاعر رہ گیا ہو جو یہاں کے مشاعرے میں نہ آیا ہو ، لیکن وہ مشاعرے کی رونق ہونے کے بجائے اپنے گھر کے کوٹھے کے ایک سادہ کمرہ میں جو عہد وسطیٰ کی یاد تازہ کرتا تھا ، چارپائی پر لیٹے ہوئے خاموشی سے اپنے ذہن میں شعر وادب کی محفل جمائے رہتے ، جب اصغرؔ ، جگرؔ ، روشؔ صدیقی ، اور فراقؔ گورکھپوری جیسے شعراء خود ان کے پاس آکر اپنا کلام سناتے تو ان اربابِ کمال کو غیر شعوری طور پر محسوس ہوتا کہ وہ فن کمال ، نظر ، فکر اور بصیرت سے مخاطب ہیں ، وہ خاموشی سے سب کا کلام سنتے ، داد روایتی طور پر نہیں دیتے ، کسی شعر کو سن کر خوش ہوتے تو ان کا چہرہ خوشی کی تمکنت ، وقار اور نشاط سے اس طرح روشن ہوجاتا کہ کلام سنانے والے اسی کو اپنے کلام کی داد کا بڑا قیمتی سرمایہ سمجھ کر مخمور ہوجاتے ، مرزا احسان صاحب بھی اس کیفیت سے متاثر ہوکر اپنی زبان سے صرف یہ کہہ اٹھتے بہت خوب ، پھر تو پڑھئے ، اتنی ہی مختصر داد پانے کے لیے باکمال شعراء ان کے برآمدے میں جمع ہوتے ، اور خوش خوش واپس جاتے ، جب خود ان سے ان کے کلام کی فرمائش کی جاتی ، تو بڑی مشکل سے سنانے پر راضی ہوتے ، پہلے تحت اللفظ سناتے رہے ، لیکن بعد میں ترنم سے سنانے لگے تھے ، جس میں ان کا اپنا انداز تھا ،

وہ زیادہ تر غزلیں کہتے جن میں ماتم سرایانِ لکھنو کی طرح نہ جنازہ بردوش

دکھائی دیتا ہے۔ نہ جلوہ فروشانِ لب بام کی عشوۂ و ادا کا دام بچھا نظر آتا ہے، نہ لفظی بازیگری اور شعبدہ بازی ہے، بلکہ ان میں تغزل کے موضوع حسن و عشق کی لطافت اور روحانی بلندی ہے، جس کا احساس ان کو خود بھی رہا، کہتے ہیں،

ہوں وہ حقیقت آشنا جس کی نگاہ شوق میں
حسن کی ہر ادا لطیف، عشق کی ہر ادا بلند

وہ غزل کو حریم حسن سمجھتے رہے، اسی لئے ان کے یہاں جلوہ گاہ بام، رقیب، عدو، ہجر و وصل کا نشان نہیں ملتا، ان کی غزل کی زبان ہجر کے شکووں سے آلودہ نہیں ہوتی، بلکہ اس سے ہمیشہ صدائے آفریں سی نکلتی رہی، آئندہ جب کبھی ان کی غزل سرائی کا صحیح تجزیہ کیا جائیگا تو اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں حسن و عشق کا ایک بلند اور اعلیٰ تخیل ہے، وہ عشق کو بقائے سرور اور انوار روحانی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، ان کے یہاں عشق قلب انسانی کی ایک لطیف اور پُرسوز کیفیت ہے جو کبھی آنکھوں کو پُرنم ضرور بنا دیتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ روح میں اتنی استعداد پیدا کر دیتی ہے کہ زبان آہ و شیون سے آلودہ نہیں ہونے پاتی ہے، بلکہ چہرہ پر انتہائی اضطراب کے عالم میں بھی ایک لطیف موجِ تبسم رقص کرتی رہتی ہے، ان کے یہاں اشک غم کی موجوں میں حسن یار کی تابانیوں کا منظر دکھائی دیتا ہے، ان کے نزدیک عشق کوئی ایسی چیز نہیں جو ہجر، شب غم کی درازی، آہ و بکا، چاک دامنی، کوچہ گردی اور دار و رسن اور رہائی کی روشنی میں دیکھی جائے، بلکہ یہ مرض کے بجائے تمام روحانی علتوں کا علاج ہے، اس کو اپنے زخم جگر کے لئے مرہم کی ضرورت نہیں بلکہ یہ خود قلب و روح کی سیرابی اور تازگی کا سامان ہے، اسی طرح ان کے یہاں حسن کا تخیل بھی بڑا باعظمت اور پاکیزہ ہے، وہ قدرعنا کو جمال روحانی کا نظارہ گاہ، چہرۂ رنگیں کو صبح زندگی کا گہوارۂ انوار، اور نگاہ ناز کے ہر اشارہ کو ساز لاہوتی کا ایک نغمۂ بے صدا سمجھتے تھے، ان ہی پاکیزہ خیالات کے ساتھ وہ

اپنی غزلیں کہتے رہے، کچھ مثالوں سے آپ بھی لطف اٹھائیں۔

ہوش بھی آئے جھوم کر تیرے کنار شوق میں
مستی عشق میں ذرا دستِ طلب بڑھا کے جا

اک شرار شوق بن کر پھونک دے ساری فضا
شیوۂ تمکیں طریق عشق میں زیبا نہیں

حریم حسن کا ہر ذرہ جگمگا اٹھے
مذاقِ عشق میں وہ آب و تاب پیدا کر

اللہ اللہ! عشق کی یہ دولتِ افتادگی
دست خاک آلود میں شمس و قمر رکھتا ہوں میں

ہاں دکھا دے اے دلِ غمگیں وہ داغ آتشیں
جگمگا اٹھے حریم حسن جانانہ ذرا

فیض سوزِ عشق سے بن جا تجلی گاہ خود
یہ مذاق سیر و گلگشتِ گلستاں پھونک دے

شعلۂ دل بلند ہو برق ستم کو پھونک دے
موج شرار شوق اٹھ وادی غم کو پھونک دے

یہ درد عشق ہے رہنے دے اسکو چارہ گر یونہی
کہ اس کی ہر تڑپ تسکینِ جاں معلوم ہوتی ہے

اللہ اللہ یہ جمالِ یار کی تابانیاں
عقل و جاں سب محو ہیں کچھ بھی نظر آتا نہیں

لئے ہوئے تجلیاں نظر ہے حسن یار کی
نہ کچھ خزاں کا خوف اب نہ فکر کچھ بہار کی

غم نے گرائیں بجلیاں آئیں نظر تجلیاں
دیدہ و دل چمک اٹھے دیکھ رہا ہوں حسن یار

روئے جاناں جس کو کہتے ہیں وہ دل کا نور ہے
دیکھئے اور اس سے حاصل ذوق ایماں کیجئے

نگاہ ناز کا ہو اک اشارۂ پنہاں
مرا مذاق محبت ذرا نکھر جائے

پھونک دے اے جمال یار خرمن آرزو مرا
اپنا مجھے دکھا مگر جلوۂ کیفِ مستقل

یہ وہ اشعار ہیں جو حسن و عشق کے صحیفۂ زبور اور کتاب توریت میں مقدس آیتیں بن سکتی ہیں، ناممکن ہے کہ ان کو پڑھتے وقت آپ کے دل کے اندر تپش اور آپ کے احساس میں گرمی نہ پیدا ہو، اور آپ غزل گو کے تخیل کی طہارت کے قائل نہ ہوں، ان کے یہاں اقبال ہی کی طرح عقل و عشق کی کشمکش پائی جاتی ہے، اور اقبال ہی کی

طرح وہ عشق کو فاتح اور کامراں دکھاتے ہیں۔

اہلِ جنوں کے واسطے بس ہے یہ راہ عشق — فرزانہ جو بنے وہ کہیں کے نہیں رہے

نکلا جنون عشق ہی رازِ حیاتِ قدس — گو لاکھ اہل ہوش و خرد نکتہ چیں رہے

آشنا اس راز سے کچھ ہیں تو بس اہل جنوں — مصلحت اندیش ہو محرومِ کیفِ زندگی

رائگاں سعی نظر بے سود فکر عقل و ہوش — کارفرما گر محبت کی نہ ہو شوریدگی

جو ہلا دیتی ہے بام عرش کے بھی کنگرے — عشق کی فطرت میں ہے وہ مستی و شوریدگی

خرد کے ساتھ اک اک قدم پہ مشکل ہے — جنوں کے واسطے کچھ بھی مگر محال نہیں

جلوۂ راز کائنات آئے گا ایک دن نظر — آتش شوق سے مگر قلب و جگر جلائے جا

نظر جب انبساطِ عشق سے سرشار ہوتی ہے — تو بڑھ کر فرشِ گل سے وادی پرخار ہوتی ہے

وہ اچھے نظم گو بھی تھے، لیکن اس فن میں دادِ سخن اسی وقت دیتے جب ان کا وجدانی ذوق خود ابھر آتا، ایک موقع پر خاک حجاز پر نظم کہنے لگے تو ایک خاص قسم کی کیف و سرور میں کہتے چلے گئے، اس کو انبساطِ سرمدی کی ایک بہشت قرار دے کر اس کو شبستان معانی کی بہار، جلوۂ سینائی، روح الامین، نشاطِ روح اربابِ نیاز، شعلۂ اندوزِ حیات جاوداں وغیرہ بتایا، لیکن ان کا قلم رکا تو پھر ان پر یہ کیفیت طاری نہیں ہوئی، اسی لیے نامکمل رہ گئی، انھوں نے حضرت امام حسینؓ کو ہدیۂ اخلاص بھی پیش کیا ہے، ایک زمانہ میں ہندوستان میں ترکی کے نجات دہندہ مصطفےٰ کمال پاشا اور ریف کی آزادی کے مجاہد غازی امیر عبد الکریم کو بڑی مقبولیت رہی، ان کے متعلق بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا، ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں میں وہ مولانا محمد علیؒ سے بہت متاثر تھے، ان کی زندگی ہی میں ان پر ایک لمبی نظم کہی، جس کے دو شعر یہ ہیں۔

ہے مایۂ کیفِ روح تیرا — توحید خلیلؑ کا ترانہ

پھر یاد دلا دیا ہے تو نے — سلمانؓ و صہیبؓ کا فسانہ

اور جب مولانا محمد علی کی وفات ہوئی تو باوجود کانگریسی ہونے کے بے اختیار کہہ اٹھے،

ذات تھی تیری مدارِ قوتِ اسلامیاں — تو ہجومِ کفر میں تنہا نورِ حق کا پاسباں

اور پھر ایک طویل مرثیہ میں مولانا مرحوم کے تمام محاسن کو بڑی خوبی سے احاطہ کیا اور جو کچھ بات مولانا کی ایک ضخیم سوانح عمری میں لکھی جا سکتی تھی، انھوں نے اپنے اس مرثیہ میں قلمبند کر دی ہے، آخر میں ان کے متعلق کہتے ہیں۔

تو علم بردار تھا توحید ابراہیمؑ کا — مستحق ہے تو یقیناً کوثر و تسنیم کا

اور جب کبھی اردو ادب میں مشاہیر پر اچھے قسم کے مراثی کی تلاش ہوگی تو اس مرثیہ کو اس فہرست میں شامل کرنا ناگزیر ہوگا۔

اصغر مرحوم سے ان کو بڑی محبت اور شیفتگی تھی، جب ان کی وفات ہوئی تو وہ بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے، لیکن ان کا قلم شدتِ احساس کا مقابلہ نہ کر سکا، پھر بھی بے تابی کے عالم میں اس کی ابتدا اس طرح کی،

مضطرب کچھ اس طرح احساسِ غم سے دل ہے آج — ضبط کرنا نالہ و فریاد کا مشکل ہے آج

ٹھیس کچھ ایسی لگی ہے ہر بنِ مو وقفِ آہ — آنسوؤں کا روکنا اک سعیِ لاحاصل ہے آج

روح کو جس سے تعلق، دل کو جس سے ربط تھا — میری نظروں میں یہ دنیا تیرہ و باطل ہے آج

پھر ان کو اس مرثیہ میں لذت شناسِ ذوقِ عرفاں، نغمہ سرائے گلشنِ جاں، واقفِ اسرار پنہاں وغیرہ کہہ کر آخر میں کہتے ہیں۔

روح کو جس نے دیا پیغامِ کیفِ سرمدی — حلقۂ اہلِ سخن سے وہ غزل خواں اٹھ گیا

شعر و ادب کی تاریخ میں یہ بات جلی حروف سے لکھی جائے گی کہ انھوں نے اپنے قلم سے اصغر کی شاعری کی روح کو نشاط، اور ان کی غزل سرائی کے نغمۂ سرمد کو زندگی عطا کی، اسی طرح داغِ جگر کو اردو شاعری کا داغِ لالہ بنا دیا، اور ان کی شاعری کے طور کو شعلہ بخشا، اسی طرح دلؔ شاہجہانپوری، یحییٰؔ اعظمی اور عارفؔ عباسی کے کلام کو ان کے سفینوں سے نکال کر اربابِ ذوق کے سینوں تک پہونچایا، لیکن یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہوگی کہ خود ان کے فکر و فن کو روشن کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، خواہ اس کو ہم اپنے نقادوں کی ناقابلِ معافی غفلت پر محمول کریں یا یہ کہ ہمارے نقادوں کی تنقید نگاری کا مرغِ باد نما اپنے آشیانے میں تڑپ کر رہ گیا، اور مرزا صاحب کے شاعرانہ تخیل کے سدرہ تک نہ پہونچ سکا۔

ان کی نثر نگاری کے کمالات ان کے مضامین کے مجموعہ مقالاتِ احسانؔ میں دیکھے جا سکتے ہیں جس میں اُن کے بہت سے ادبی و تنقیدی مضامین ہیں، اُن کو پڑھ کر اربابِ ذوق نے اُن کے ادبی ذوق کی بلندی کی داد دی ہے، اور اُن کی تر و تازگی میں بہت کچھ مولانا شبلی کا رنگ جھلکتا ہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ شاعر اچھے تھے، یا نثر نگار، وہ خود لکھتے ہیں کہ "بہ نسبت شاعری کے میری طبیعت کا رجحان زیادہ تر نثر نگاری کی طرف رہا ہے"، اور اپنے فطری عجز و انکسار کے باوجود بھی کہہ گئے ہیں،

خاکِ اعظم گڈھ کا سہی ہوں لیکن ہے جن کو ادعا
آ کے دیکھیں یہ مرا رنگِ ادیبانہ ذرا

لیکن ایک جگہ یہ بھی لکھ گئے ہیں،

پوچھتا ہے تجھ سے کیا احسان کا رنگِ مزاج
تو نے کیا اشعار میں اُس کو کہیں دیکھا نہیں

یعنی وہ اپنے اصلی رنگ میں اپنے اشعار ہی میں دیکھے جا سکتے ہیں، مگر سچ تو یہ ہے کہ ان کو ان کے ادیبانہ رنگ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے، انھوں نے اپنی انشار پردازی کا تجزیہ خود ہی یہ لکھ کر کر دیا ہے کہ "میرے نزدیک اردو انشاپردازی کا بہترین اور اعلیٰ ترین نمونہ علامہ شبلی مرحوم کا طرزِ تحریر ہے، میں نے اپنے مضامین میں اسی انداز انشا کی تقلید کی ہے، اور بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے"، ان کا یہ لکھنا بہت صحیح تھا، مولانا شبلی کی انشاپردازی کی خصوصیات مختصر طریقہ پر اس طرح ادا کی جا سکتی ہیں کہ کبھی یہ بڑی باعظمت، باوقار، باسطوت ہوتی ہے، کبھی بہت ہی حسین و رنگین اور شیریں، کبھی بہت فصیح اور بلیغ، اور کبھی ذہن کو مرعوب اور تسخیر کرنے والی ہوتی ہے، مرزا صاحب کی نثر نگاری، مولانا شبلی کا مکمل نمونہ تو نہیں، لیکن وہ جب کبھی نثر میں کوئی مضمون لکھنے بیٹھتے تو مولانا کے باوقار، پرشکوہ فقرے، اور دل پذیر نثری شہ پارے ان کی ذہنی نظروں کے سامنے تیرتے نظر آتے، اور پھر وہ غیر شعوری طور پر ان کو اپنی تحریروں میں اس طرح لکھ جاتے کہ ان کے مضمون کے بعض ٹکڑے مولانا شبلی ہی کے معلوم ہوتے ہیں، اور پھر اپنی رائے کا اظہار بھی مولانا شبلی کی طرح کچھ ایسے بلیغ پیرایے میں کرتے کہ ان کے ناظرین کا ذہن اس کو تسلیم کرنے میں زیادہ نہ ہچکچاتا، ان کی باوقار، باعظمت تحریر کا لطف ان کے مضمون "یادِ سہیل" سے کیا جا سکتا ہے، اور یہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے، کہ اس انداز کی پُر از وقار ادیبانہ اور ناقدانہ تحریر لکھنے والا اس دور میں ملک میں شاید ہی کوئی ملے، ان کی جاندار اور شاندار تحریروں کے نمونے، فانیؔ اور جگرؔ کی شاعری پر تبصرے میں بھی مل سکتے ہیں، اُن کے یہاں رشحۂ انوار

جلوۂ جاں نواز، جمالِ سرمدی، فیضانِ لالہ زار طور، لطافت سنبل و ریحان، جبین قلم اور حریم قلب جیسی ترکیبوں اور نسیم مغفرت کے جھونکے، تسنیم و کوثر کی موجیں، وادیِ ایمن کی شرر باریاں، ایوان باطل کے بام و در، اسرار و حکم کے انمول موتی، دریائے کرم کی گہر ریز موجیں، زندہ روح کی آتش فشانیاں، برق سرِ طور کی شرر افشانیاں، فتنہ گران سرِ بام کی عشوہ طرازیاں وغیرہ جیسے فقروں میں مولانا شبلی کی تحریروں کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

کچھ ان کی انشا پردازانہ تحریر کے اقتباسات سے بھی لطف اٹھا کر یہ فیصلہ کریں کہ مولانا شبلی کی روح ان کو کس طرح گھیرے رہتی تھی، اقبال سہیل نے اپنی ایک نظم میں مسلمانوں کی اسلامی غیرت کو اس طرح ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

فدیۂ جاں پیش کر اے پیرو دین حنیف
ذوق قربانی ہے پہلا امتحان زندگی

استقامت کا سبق لے اسوۂ صدیق سے
پھر زمانے کو سنا دے داستانِ زندگی

ہاں جنونِ شوق اٹھ پھر کے فاروقی علم
پھر دکھا دے دیدۂ عالم کو شانِ زندگی

خرمن باطل کو خاکستر بنا کر چھوڑ دے
ہر نفس تیرا ہو اک برق تپان زندگی

ان اشعار کو مرزا صاحب نے اپنے قلم کے رشحۂ انوار سے یہ لکھ کر اور بھی منور کر دیا ہے'

"مبارک ہے وہ دل جو ان پاکیزہ جذبات کا حامل ہو، آفریں ہے اُس زبان پر جو اسوۂ صدیق و فاروق کی پیروی کی دعوت دے کہ بغیر اس پر عمل کئے ہوئے تہذیب مغرب کے پُرفریب منظر کا تسلط ہماری نگاہوں سے زائل نہیں ہو سکتا، اور نہ ہم کو وہ اخلاقی و روحانی قوت نصیب ہو سکتی ہے، جس کے بل پر کبھی کچھ بے سر و سامان صحرا نشینوں نے اٹھ کر قیصر و کسریٰ کے شاہانہ غرور و تمکنت کو خاک میں ملا دیا تھا، مسلمان اگر اب بھی اسلام کے جادۂ حق

پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر ان کے قلب و جگر کو ذلت و رسوائی کی ٹھوکروں سے ملول نہ ہونا چاہئے۔ وہ قطعی طور پر سمجھ لیں کہ ان کا ظلمت کدۂ حیات صرف اسی آفتاب ہدایت کے فیضانِ تجلی سے منور ہو سکتا ہے، جو نامحدود تابانیوں کے ساتھ حجاز کے صحرائے ویران سے طلوع ہو کر جلوہ آرائے کائنات ہوا تھا، طلب صادق ہو تو آج بھی اس کی ضو فشانیاں آمادۂ کرم ہیں، خوف ماسوا دلوں سے دور ہو تو آج بھی ہمارا نعرۂ توحید قصر باطل کے کنگروں کو ہلا سکتا ہے، اور پھر کسی فتنۂ روزگار کو ہم سے الجھنے کی ہمت نہیں ہو سکتی۔"

اور جب اقبال سہیل کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہیں، تو اپنے قلم کے جلوۂ جاں نواز کا رنگ بدل کر لکھتے ہیں۔

"ممکن ہے کہ ان کی غزلوں میں کسی شوریدہ مزاج کے پُرگداز عاشقانہ جذبات کی شرر باریاں نظر نہ آئیں، لیکن ہم کو مسرت ہے کہ وہ اس میکدہ میں ایک رسوائے سر بازار کی تبذل اداؤں کے ساتھ نہیں بلکہ ایک بلند حوصلہ اور عالی نظر رند کی حیثیت سے داخل ہوئے ہیں جس کا ہر قدم عزت نفس اور خود داری کے احساس سے اٹھتا ہے، جو بندگی کی لعنت کے ہوتے ہوئے زندگی کی صورت دیکھنا گوارا نہیں کرتا، جس کو خود اپنے دست و بازو کا تعمیر کردہ نشیمن دنیا میں سب سے زیادہ محبوب ہے، جس کی غیرت عشق کسی حال میں حسن سے سوال کرم پر آمادہ نہیں ہوتی، جس کے ذوق جستجو کی ہمت منزل کو ہر قدم پر گریزاں بنا دیتی ہے، جس کی موجِ زندگی کو شورشِ عمل کے لئے ہمیشہ پُرخطر راہوں کی تلاش رہتی ہے، جس کا غم کدۂ حیات جمال غیر کے ہر دو ماہ سے نہیں بلکہ خود اپنے ہی سوز دل کی تراوش نور سے جگمگاتا رہتا ہے۔"

ذرا ان کی تحریر کے کچھ چھوٹے چھوٹے شہ پاروں سے بھی لطف اٹھائیے۔

آشک غم کی موجوں میں حسن یار کی تابانیوں کا منظر پیش کرنا مصوریاسیات کے بس کی چیز نہیں، یہ صلاحیت بزم محبت کے ان ہی محرمانِ خاص کو نصیب ہوسکتی ہے، جنھوں نے اہل ذوق کو زندگی کا یہ پُر اسرار پیام دیا ہے۔" (مقالات حسان ص ۱۵۹)

"اصغر نے جو ترانہ سرمدی چھیڑ دیا ہے، اس سے فضائے آسمانی گونجتی رہے گی، دنیائے ادب اُسی وقت تک طلسم باطل کے سامنے سر نیاز خم کرسکتی تھی، جب تک جمال حقیقت اس کی نگاہوں سے مخفی تھا، لیکن اب اصغر کے ظہور نے ان تمام پردہ ہائے فریب کو دفعۃً الٹ دیا، اور تشنگانِ ذوق کو نظر آگیا کہ اب تک جو کچھ ان کے سامنے تھا، اس میں کوئی مستقل کیفیت یا لذت نہ تھی بلکہ محض تصنع اور تکلف کا ایک طلسم بے ثبات تھا۔"

ان کی ناقدانہ نظر میں بڑی بلندی رہی، ان کا ذوق لکھنو کے رنگ شاعری کو پسند نہ کرتا، وہ لکھنو کے غزل گو شعراء کو لفظی شعبدہ پرداز، لفظی بازیگر، کم نظر، پست خیال، سینہ کوب، نوحہ گر، ماتم گسار، سوز خوان، مریض بستر اور زلف و کمر کا پرستار سمجھتے تھے، انکی اس رائے سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن اپنے اس ادعا کو ہر طرح ثابت کرنے کی فکر میں لگے رہے، اور پرزور طریقہ پر اسی کی وکالت کی، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"افسوس ہے لکھنو کی بدمذاقی نے درد عشق کو ایک مستقل مادی مرض بنا دیا جس کی تکلیف سے کبھی مریض بستر پہ کروٹیں بدلتا ہے، کبھی نالۂ نیم شبی سے ہمسایوں کی نیند حرام کردیتا ہے، کبھی اعضا میں تشنج پیدا ہو جاتا ہے، کبھی رگیں کھچنے اور ٹوٹنے لگتی ہیں، کبھی چہرہ زرد پڑ جاتا ہے، کبھی ہچکیاں آتے آتے دم گھٹنے لگتا ہے، بالآخر نزع کا عالم طاری ہو جاتا ہے، بے وفا معشوق کا اب بھی پتہ نہیں، روح پرواز کر جاتی ہے، جنازہ نکلتا ہے، نوحہ خوانی ہوتی ہے اور آزار محبت سے نجات مل جاتی ہے، حضرات لکھنو کے گداز محبت اور

درد و عشق کی یہی کل سرگذشت ہے، جس پر ان کو ادعا ہے کہ وہ تغزل کے رمز شناس ہیں، کیا گریہ و بکا آہ و زاری، اعضا شکنی، جنازہ و میت وغیرہ اسی مقدس درد محبت کے آثار و علائم ہیں؟

دبستانِ لکھنو والے اس کا جواب ضرور دے سکتے ہیں لیکن اوپر کے اقتباس میں جو طنز بلکہ استہزاء ہے، اس کی چبھن ضرور محسوس کریں گے، ایک دوسرے موقع پر لب ولہجہ ذرا اور تیز ہو جاتا ہے، جس کو اب بھی لکھنوی غزل گو شعراء پڑھ کر مضطرب ہو جائیں گے؛

"وہ نگاہیں جن کو حسن نامحدود کی اداؤں کا رمز شناس ہونا چاہئے تھا محض شاہدانِ لب بام کی عشوہ طرازیوں کے دام فریب میں پھنس کر رہ گئیں، وہ ہاتھ جس کو جمال حقیقت کے چہرے سے نقاب الٹنا چاہئے تھا، رقیب کے زدوکوب میں مصروف ہوگیا، وہ قلب جس کو اسرار و معارف کی تجلی گاہ ہونا چاہئے تھا محض جلوہ گاہِ ہوس بن کر رہ گیا، وہ آنکھ جس کے ہر قطرۂ آب سے انوار محبت کی بارش ہونی چاہیے تھی، بستر غم پر زہر فشانی کرنے لگی، وہ لب جسے نوائے حیات کی ترنم ریزیوں سے معمور ہونا چاہئے تھا، صرف آہ و بکا کے لیے وقف ہوگیا، وہ دماغ جس کو نشاط امید سے مخمور ہونا چاہئے تھا، یاس و ملال کا وحشت کدہ بن کر رہ گیا، لیکن افسوس ہے کہ باوجود اس کے کہ دنیا کا مرقع الٹ گیا، افق حیات مختلف قسم کی رنگینیوں سے معمور نظر آتا ہے طبیعتیں آہ و بکا سنتے سنتے گھبرا اٹھی ہیں، حضرات لکھنو اسی ماتم کدے میں بیٹھے ہوئے اب تک مصروف ماتم ہیں" مقالات احسان ۳۵ - ۲۳۴)

لیکن یہ طنز و استہزاء تخریب کے لئے نہیں بلکہ اصلاح کی خاطر ہے لکھنؤ کی غزل گوئی میں خوبصورت اور چست الفاظ کی بازیگری سے معنوی حیثیت سے جو بے کیفی

پیدا ہو گئی تھی، اس سے حسن و عشق کی روحانی لطافتیں ختم ہو رہی تھیں، مرزا صاحب اس کو دلگیر تھے، اور وہ اس انداز تغزل میں اصلاح چاہتے تھے، اسی لئے انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ نالہ و ماتم کی انتہا ہو چکی، اب ضرورت ہے کہ مذاق شعری میں کچھ لطافت اور بلندی پیدا کی جائے، عشق و محبت کے ایسے جذبات ادا کئے جائیں جن سے روح کو خاص لذت حاصل ہو، اور شریفانہ اخلاق کے نشو و نما میں مدد ملے حزن و افسردگی زندگی کا نام نہیں بلکہ راز حیات صرف اسی اضطراب مبہم میں پنہاں ہے جس سے عاشق کا قلب معمور ہو جاتا ہے (مقالات ص ۲۳۵)

وہ اپنی زندگی میں خوش تھے کہ ان کو جس معیار کے تغزل کی تلاش تھی، وہ ان کو اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کے یہاں مل گیا، بلکہ ان کو اس کا اعتراف کرنے میں تامل نہیں ہوا کہ اصغر مرحوم کی ملاقات اور ان کے مطالعہ نے ان کے ذوق شاعری میں بہت کچھ بلندی اور وسعت پیدا کی (پیام کیف ص ۶) وہ اصغر کی شاعری کے کچھ ایسے دلدادہ ہوئے کہ ۱۹۲۵ء میں ان ہی نے اصغر کی منتشر غزلوں کا ایک مجموعہ نشاط روح کے نام سے مرتب کیا، اور پہلی دفعہ ارباب ذوق کو بتایا کہ "اصغر ایک ایسے یگانۂ فن ہیں، جن کی نازک خیالیاں دردآشنا قلوب کو ہمیشہ تڑپاتی رہیں گی، وہ ایک نکتہ رس اور بلاغت شناس دماغ کے مالک تھے، اس لئے ان کی نظر عامیانہ جذبات کی سطح سے گذر کر روح انسانی کے اُن لطیف حقایق و معارف تک پہونچتی ہے، جو دراصل عشقیہ شاعری کی جان ہیں، وہ عام شاہراہ سے الگ ہو کر اکثر حکیمانہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں، لیکن اس طرح کہ شعریت کو کہیں سے صدمہ پہونچنے نہیں پاتا، وہ انداز بیان کی لطافت اور جدت سے ہمیشہ ایسے بلند اور لطیف جذبات و احساسات کی مصوری کرتے ہیں، جہاں تک عام نگاہیں پہونچنے سے قاصر ہیں، وہ فارسی ترکیبوں کے خاص طور سے دلدادہ ہیں، لیکن چونکہ نکتہ سنج ہیں، اس لیے ایسی لطیف ترکیبیں استعمال کرتے ہیں،

جن سے شعر میں ایک خاص رعنائی اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے، اور جہاں تک جوش، رقص اور مستی کا تعلق ہے ان کو بجا طور پر اردو کا حافظ کہا جا سکتا ہے، وہ اپنے پہلو میں ایک زندہ اور بیدار دل رکھتے ہیں، جو سراپا نشاط حیات سے معمور ہے، اس لیے ان کی زبان سے جو حرف نکلتا ہے، کیف و سرور سے لبریز ہوتا ہے اسی کے ساتھ جس رنگینی کے ساتھ انھوں نے پر کیف جذبات ادا کئے ہیں، اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے"، اصغر کی ان خصوصیات کو مرزا صاحب نے نشاط روح کے مقدمے میں مثالیں دے کر بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے، اور ان کی کوئی تردید نہیں کر سکتا ہے، ۱۹۲۵ء سے اب تک اصغر کو جو کوئی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ مرزا صاحب ہی کے ذریعہ سمجھتا ہے، اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ غالب نے اپنے سینہ کی امانت جو اپنی شاعری کے سفینہ میں منتقل کی تھی، اس کو حالی نے قوم تک پہونچایا، اسی طرح مرزا صاحب نے اصغر کے سفینہ کی امانت شاعری کو لوگوں کے سینے تک پہونچایا، مومن کے رموز و نکات کو جس طرح ضیاء احمد بدایونی نے آشکارا کیا، اسی طرح مرزا صاحب نے اصغر کی شاعری سے لوگوں کے کام و ذہن کو لذت آشنا بنایا،

اور جب جگر کو کوئی نہیں جانتا تھا تو اس وقت مرزا صاحب نے جگر کے متعلق یہ لکھ کر دعویٰ کیا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی قوت تخیل سے تغزل کو ایک پیکر اعجاز بنا دیا ہے، اور پھر بڑے وثوق کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ عزیز، جوش، حسرت، ثاقب وغیرہ کی زمزمہ سنجیاں بے شبہہ موجودہ غزلیہ شاعری کے لیے سرمایۂ ناز ہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ حضرت جگر کے آفتاب کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کر دیا ہے، ان کا یہ لکھنا بالکل صحیح تھا، کیونکہ اس کے چالیس برس کے بعد جب جگر کی وفات ہوئی تو وہ خوش تھے کہ وہ "داغ جگر" جو چالیس سال پہلے نمایاں ہوا تھا کسی شکستہ مزار کا ٹمٹماتا چراغ نہ تھا،

بلکہ اس میں شعلۂ طور اور آتش گل کے تڑپتے ہوئے جلوے بھی پوشیدہ تھے، جن کے پرتو سے عرصہ گاہ تغزل جس پر ایک مدت سے بداخلاقی کی تیرگی چھائی ہوئی تھی، ایک دفعہ پھر وادیٔ ایمن بن گیا۔

جگر و اصغر کے معاصروں میں فانی بھی تھے، جن کے کلام کو بھی بڑی شہرت ہوئی، لیکن مرزا احسان ان کے مداح ہونے کے بجائے ان کے ناقد رہے، وہ ان کی گریہ وزاری اور سینہ کوبی کو پسند نہیں کرتے، ان پر یہ لکھ کر ضرب کاری لگائی ہے کہ تغزل کی بزم کیف میں خانگی آلام ومصائب کا تذکرہ کسی لحاظ سے جائز اور مناسب نہیں، شاعر کو اگر محض اپنی ذاتی ناکامیوں کا ماتم کرنا ہے تو اس کے لیے مرثیہ کا میدان کھلا ہوا ہے جہاں وہ خوب جی کھول کر سینہ کوبی اور گریہ وزاری کر سکتا ہے، کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا، لیکن حسن وعشق کی بزم تجلی میں قدم رکھ کر اس کو مرثیہ خوانی کی اجازت نہیں مل سکتی، یہ وہ مقام ہے جہاں درد وغم ہی کی لذت سے قلب وروح کی پرورش ہوتی ہے، جہاں نزول مصائب پر مرحبا کی صدائیں بلند کی جاتی ہیں، اور جہاں پہونچ کر حیات انسانی کی تمام دشواریاں آسان ہو جاتی ہیں، اس بنا پر یہ راہ نوحہ خوانوں کے لئے نہیں بلکہ شوریدہ مزاجوں کے لئے مخصوص ہے، جو اس نکتہ سے واقف ہیں" ممکن ہے اس رائے سے ہمارے بعض ناظرین کو اتفاق نہ ہو، لیکن غزل گوئی سے متعلق یہ ژرف نگاہی کسی دیدہ ور غزل گو ہی کے یہاں پائی جا سکتی ہے، پہلے کہا جا چکا ہے، وہ لکھنؤ اہل لکھنؤ کی شاعری کے قائل نہ تھے، ان کا خیال تھا کہ اہل لکھنؤ کے ماتمی ذوق کی بدولت تغزل صرف ایک جسد بے روح بن کر رہ گیا، ان کی رائے میں فانی لکھنویت کے شکار ہو کر غزل خواں ہونے کے بجائے صرف نوحہ خوان اور سوز خوان بن کر رہ گئے۔

احسان صاحب ان خوش نصیب نقادوں میں تھے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا اس کی نہ تردید کی گئی، نہ مخالفت کی گئی، میر جعفر علی اثر لکھنوی سے ان کی کچھ ادبی نوک جھونک ضرور ہوئی،

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے اثر لکھنوی جیسے استاد فن کے سامنے سپر ڈال دی تھی، یا ان ہی کے وار کہیں کہیں کاری ثابت ہوئے ہیں، دوسرے ارباب نظر کو ان کی رائے کے قبول کرنے میں گو تامل ہو ویسے پاکیزہ اور سنجیدہ ذوق رکھنے والے اُن کے قدرداں رہے، شاید جگر نے کہا ہے،

میں جگر لاکھ ہوں آوارہ وسرگشتہ مگر
دل ہر اک حال میں ہے حضرت احسان کے قریب

مولانا سید سلیمان ندوی ان کی تحریر کے زور، روانی، اور سلاست کے مداح تھے، لاہور کے مولانا تاجور نجیب آبادی ان کو بڑا سخن فہم اور سخن طراز سمجھتے، ان کی نثری تحریر کو نتیجہ عرق ریزی اور عطر دماغ سوزی کہتے، لاہور کے رسالہ ہمایوں کے اڈیٹر میاں بشیر احمد بیرسٹرایٹ لا ان کے مضامین کے پرمغز اور بلند پایہ ہونے کے معترف تھے، شیخ عبدالقادر اڈیٹر رسالہ مخزن کا خیال تھا کہ اردو زبان کا ذخیرہ ان کی ادب نواز بولیوں سے مزین ہوا، مرزا یاس عظیم آبادی ثم لکھنوی اپنے غرور اور پندار میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، لیکن وہ بھی مرزا احسان صاحب کے علم وفضل اور ادبی ذوق کے غائبانہ معترف رہے، نیاز فتح پوری بھی ان کے زور قلم، حسن انشا، خوش ذوقی اور قوت استدلال کے قائل تھے، ان کی شاعری کے متعلق دیا نرائن نگم اڈیٹر زمانہ نے لکھا تھا کہ ان کا تجلی ریز کلام جلوہ زار ادب ہے، لکھنؤ کے ایک اہل نظر بزرگ جگ موہن نرائن مسرا نے ان کے مجموعۂ کلام پیام کیف کے ہر شعر کو جام کیف قرار دیا، اور پھر لکھا کہ اس کے فلسفیانہ اشعار اپنے رنگ میں بے عدیل اور صوفیانہ خیالات بھی خوب ہیں، عشق کی بے خودی اور سرمستی کا ذکر جن اشعار میں ہے ان کے بیان نے مجسم کیف بنا دیا ہے،

وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، اپنی سنجیدگی، وضعداری محبت اور شرافت کی یادوں کا چراغ روشن کر کے چلے گئے، دعا ہے کہ کوثر و تسنیم کی شرابِ طہور سے مخمور اور سرشار ہوں، لیکن اُن کی بڑی خدمت اب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے "پیامِ کیف" میں سرور کا جو پیام دیا ہے، اس کا صحیح مطالعہ اور تجزیہ کر کے ہم اربابِ ذوق تک پہنچائیں، انھوں نے شاعری اور نثری تحریروں میں اپنے وجدانِ سلیم سے جو فکر و فن پیش کیا ہے، اس کو روشن اور واضح کر کے لوگوں کو اس سے محظوظ و لطف اندوز کرائیں؛

مقالاتِ احسان

مرزا احسان احمد صاحب مرحوم جہاں ایک باکمال شاعر تھے، نکتہ سنج ادیب اور نقاد بھی تھے، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اُن کی ادبی صلاحیت کے بڑے قدردان تھے، اُن کے کئی مضامین انھوں نے بڑے فخر و انبساط کے ساتھ معارف میں شائع کئے، مرزا صاحب نے مشقِ سخن کے ساتھ بہت سے ادبی تنقیدی مضامین بھی لکھے، اُن کی شاعری کی طرح یہ مضامین بھی اُن کے بلند ادبی ذوق کا نمونہ ہیں، یہ ان کے ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں، مثلاً علامہ شبلی بحیثیت شاعر، یادِ سہیل، نشاطِ روح پر ایک نظر، اردو شاعری وغیرہ،

ضخامت ۲۸۸ صفحے

قیمت ۶۵-۱۵ روپے

"منیجر"

خطیب بغدادی
اور
ان کے بعض مخطوطات

از: ڈاکٹر ریاض الرحمن خان شروانی، ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۲)

مولانا آزاد لائبریری کے ذخیرۂ حبیب گنج میں خطیب بغدادی کے دو اور مخطوطے بھی محفوظ ہیں، ایک الکفایۃ فی علم الروایۃ ہے، جس کے بارے میں عرض کیا گیا کہ طبع ہو چکی ہے، اس کا موضوع اصول حدیث ہے، یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدرآباد سے پہلی دفعہ ۱۳۵۷ھ میں شایع ہوئی تھی، دوسرا ایڈیشن ۱۳۹۵ھ میں شایع ہوا۔ دوسرے ایڈیشن میں مصنف کے حالات کا اضافہ ہے، جس کی کمی پہلے ایڈیشن میں نمایاں تھی، آخر میں فہرستِ عنوانات شامل ہے، اس کے مصححین کے سامنے دو مخطوطے تھے، ایک مکتبۂ آصفیہ کا اور دوسرا استنبول کا، اس کی تصحیح و تہذیب کا کام پہلے مولانا عبد اللہ سورتی نے شروع کیا تھا، اس وقت تک استنبول کا نسخہ دستیاب نہیں ہوا تھا، بعد میں مولانا سید ہاشم ندوی اور ان کے رفقا نے اس کی تکمیل کی، اسی دوران استنبول کے نسخہ کی نقل حاصل کر لی گئی تھی، مصححین نے اعتراف کیا ہے کہ استنبول کا نسخہ بہت عمدہ ہے، دورانِ تصحیح اتفاق سے شیخ ابراہیم حمدی المدنی (مدیر مکتبہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ) کا حیدرآباد میں ورود ہوا، اس کام میں انھوں نے مصححین کی مدد کی، ظاہر ہے کہ حبیب گنج کے نسخے کا اُن حضرات کو علم نہیں تھا، تقابلی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حبیب گنج کا نسخہ مکتبۂ

آصفیہ کے نسخے سے مختلف نہیں ہے، جس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالباً دونوں ایک ہی نسخے سے نقل کئے گئے ہیں، حبیب گنج کے نسخے کے اوراق ۲۷۸ ہیں، اور ہر صفحہ پر ۱۸ سطریں ہیں، سائز ۸ × ۱۳ ہے۔ خط نسخ میں لکھا گیا ہے، عنوانات خط شنجرف میں ہیں، کتاب کے آخر میں فہرست ابواب کا اضافہ ناظم کتاب خانہ مولوی معین الدین نے کر دیا ہے، اور اس کے آخر میں ۲۹ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ تاریخ درج ہے، نسخے کے کاتب کا نام اور سنہ کتابت مرقوم نہیں ہے، اس کے بخلاف مکتبۂ آصفیہ کے نسخے کے آخر میں کاتب کا نام عبدالرحمٰن بن علی بن اسماعیل الملقب بزین التبریزی اور تاریخ کتابت "العشر الاخیر من شهر شعبان المعظم سنة ثمان وأربعين وثمانمائة من الهجرة النبوية على صاحبها افضل الصلاة والسلام واتم التحية" مرقوم ہے، دونوں نسخوں کا آغاز ایک ہی طرح ہوتا ہے یعنی "نا" (حبیب گنج کے نسخہ میں اس کی جگہ ثنا ہے) ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب البغدادی الحافظ رحمه الله تعالیٰ"

اس کے برعکس استنبول کے نسخہ میں حسب ذیل عبارت کا شروع میں اضافہ ہے۔

"اخبرنا الشیخ ابو عبد الله محمد بن علی بن ابی العلاء المصیصی بدمشق"

بیچ بیچ میں اس طرح کے اور اختلافات بھی ہیں، حبیب گنج اور حیدرآباد کے نسخوں کا اختتام بھی ایک جیسا ہی ہے، یعنی دونوں نسخے اس عبارت پر ختم ہوتے ہیں۔

"هذا آخر كتاب الكفاية في علم الرواية، والحمد لله رب العالمين والسلام على رسوله محمد وآله وصحبه (حبیب گنج کے نسخے میں "اصحابہ" ہے) اجمعین" الا یہ کہ جیسا کہ مرقوم ہوا حیدرآباد کے نسخے میں کاتب کا نام اور سنہ کتابت بھی درج ہے، جو حبیب گنج کے نسخے میں نہیں ہے، اس کے بخلاف نسخۂ استنبول کے آخر میں

یہ عبارت ملتی ہے،

"هذا آخر كتاب الكفاية في علم الرواية، والحمد لله رب العالمين والسلام على رسوله محمد وآله وصحبه وسلم تسليما كثيرا. في الأصل الذي نسخت منه كتبه لنفسه عبد العظيم بن عبد القوي ابن عبد الله المنذري"

اس کے بعد کتاب کی سند بیان کی گئی ہے، جو خطیب بغدادی تک پہنچتی ہے، اس نے مطبوعہ کتاب کے ڈیڑھ صفحوں کا احاطہ کیا ہے، پھر کاتب کا نام "عبدالرحمٰن بن محمد بن حسن الریحاوی مولداً، الحلبی منشأ" دیا ہوا ہے، اور کتابت کی تاریخ اس طرح درج ہے۔

"وذلك غرة شهر رجب المبارك ثلاث ومائة والف من الهجرة النبوية على صاحبها افضل الصلاة والتسليم خاتم النسخة" بالکل آخر میں حسب ذیل عبارت ہے۔

هذا وقف سلطان الزمان الغازي سلطان سليم خان ابن السلطان مصطفى خان عفي عنهما الرحمن

بروکلمان نے مختلف مقامات پر اس کے ۱۳ نسخوں کی نشاندہی کی ہے، لیکن قدرتی طور پر حبیب گنج کے نسخہ کا اس میں بھی ذکر نہیں ہے،

دوسرا مخطوطہ "کتاب غنیة الملتمس (فی) ایضاح الملتبس" ہے، کتاب کے نام میں سرورق پر کاتب سے "فی" چھوٹ گیا ہے، یہ کتاب اسماء الرجال میں ہے، نسخہ کے آخر میں کاتب کا نام بدرالدین احرار عراقی اور تاریخ کتابت ۲۱-۹-۱۳۳۵ھ درج ہے، ظاہر ہے، یہ نسخہ حال کا لکھا ہوا ہے، یہ ۵۶ اوراق پر مشتمل ہے، اور ہر صفحہ پر

۱۵ سطریں ہیں، سائز ۸ × ۱۳ ہے، خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے، خطیب بغدادی کی اس تصنیف کا ذکر ان کے کئی سوانح نگاروں نے کیا ہے، لیکن اس کے نام میں کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے، مثلاً ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں سمعانی کی روایت کے بموجب اس کا نام "غنیۃ المقتبس فی تمییز الملتبس" بیان کیا ہے[۱]

یوسف العش نے اپنی تصنیف میں جہاں حروف تہجی کے اعتبار سے خطیب کی تصانیف کی فہرست درج کی ہے، وہاں اس کا مختصر نام "غنیۃ المقتبس" اور "غنیۃ الملتمس" دونوں طرح درج کیا ہے، اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف کتابوں میں یہ نام مختلف طریقہ سے آیا ہے، البتہ جہاں ان کی کتابوں کا تفصیلی تذکرہ ہے، وہاں پورا نام "غنیۃ الملتمس فی ایضاح الملتبس" ہی لکھا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک زیادہ صحیح یہی نام ہے، انھوں نے بتایا ہے کہ اس کتاب کا ذکر المالکی، ابن الجوزی، یاقوت، الذہبی اور شہبہ نے اپنی کتابوں میں کیا ہے، لیکن اول الذکر تین مصنفوں نے اس کا نام "غنیۃ الملتمس فی تمییز الملتبس" لکھا ہے[۲] بروکلمان نے اس کتاب کا نام وہی بتایا ہے، جو ہمارے پیش نظر مخطوطے پر درج ہے، اس نے اس کے دو قلمی نسخوں کی نشاندہی کی ہے، جن میں سے ایک برلن میں ہے اور دوسرا مکتبۂ آصفیہ حیدرآباد میں[۳]، یوسف العش نے بھی اپنی تصنیف میں بروکلمان ہی کے حوالہ سے اس کے دو مخطوطوں کا ذکر کیا ہے لیکن تفصیل بیان نہیں کی ہے۔

---

[۱] الذہبی: تذکرۃ الحفاظ [۲] یوسف العش: الخطیب البغدادی

[۳] Broekelmann S. I. 564 (Leiden, 1943)

حدیث ایک ایسا علم ہے جس کا خاص تعلق مسلمانوں سے ہے، مسلمانوں نے اس کی بڑی خدمت کی ہے، اور اس سے مختلف علوم و فنون وجود میں آئے ہیں، ان میں سے ایک اسماء الرجال بھی ہے، حدیث کی صحت کا دار و مدار علمائے اسلام کے نزدیک اسناد پر ہے، اور اسناد کے قابل اعتماد ہونے کے لیے راویوں کے حالات سے واقفیت ضروری ہے، یہی ضرورت اس فن کی ایجاد کا سبب بنی، اور اس میدان میں مختلف علماء نے اہم کارنامے انجام دیئے جیسا کہ عرض کیا گیا، خطیب بغدادی کو حدیث و تاریخ سے خاص دلچسپی تھی یوسف العش کی روایت کے مطابق ان کی تصانیف میں ایک تہائی کا تعلق تاریخ سے ہے، لیکن جب ہم زیادہ گہری نظر سے مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ان میں سے بھی زیادہ تر محدثین کی تاریخ اور رجال حدیث کی تنقید کے دائرے میں آتی ہیں، انھوں نے بتایا ہے کہ خطیب کی تالیف کردہ ۶۹ کتابیں رواۃ اور محدثین سے بحث کرتی ہیں[۱] پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس کا موضوع بہت دلچسپ ہے، کسی شخص نے (جس کا نام مذکور نہیں ہے) خطیب سے اپنے اور ایک دوسرے شخص کے مابین اس بحث کا ذکر کیا ہے کہ سلیمان بن المغیرۃ اور سلیمان بن ابی المغیرۃ ایک ہی آدمی ہیں، یا دو مختلف آدمی، فریق مخالف کا خیال تھا کہ وہ ایک ہی آدمی ہیں، جس طرح معدان بن طلحہ ہی ابن ابی طلحہ اور یوسف بن سلیمان ہی ابن ابی سلیمان ہیں، پھر اس بارے میں اس نے خطیب کی رائے دریافت کی، خطیب نے جواب دیا کہ جہاں تک معدان بن طلحہ اور یوسف بن سلیمان کا تعلق ہے، تم سے بحث کرنے والے کا خیال صحیح ہے، کیونکہ جب ابو عمرو الاوزاعی، معدان کی حدیث روایت کرتے ہیں، تو ان کا نام ابن طلحہ بتاتے ہیں، اور ان کے علاوہ بعض

---

[۱] یوسف العش: الخطیب البغدادی۔ ۱۴۵ - ۱۴۶

دوسرے لوگ ابن ابی طلحہ کہتے ہیں، اسی طرح سفیان الثوری اور عبداللہ بن مبارک یوسف کو ابن ابی سلیمان کہتے تھے، اور ان کے علاوہ بعض دوسرے لوگ ابن سلیمان کہہ کر ان کا ذکر کرتے تھے، لیکن تم سے بحث کرنے والے نے اس پر قیاس کرکے سلیمان بن مغیرہ کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے، وہ درست نہیں ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ سلیمان بن المغیرہ اور سلیمان بن ابی المغیرہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، پھر وہ ایک کلیہ بیان کرتے ہیں، اور وہ یہ کہ رواۃ کے ناموں کا تعلق سماع سے ہے نہ کہ قیاس سے، اگر وہی راستہ صحیح ہوتا جو تم سے بحث کرنے والے نے اختیار کیا ہے تو معاملہ بہت آسان ہو جاتا اور اصحابِ حدیث کو اس بارے میں اس قدر تگ ودو نہ کرنی پڑتی، پھر انھوں نے ایسے رواۃ کی ایک فہرست دی ہے، جن کے ناموں میں اس طرح کی مشابہت ہے، اور بتایا ہے کہ وہ الگ الگ لوگ ہیں، سلیمان بن المغیرۃ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نسب کے اعتبار سے قیسی اور بصرہ کے رہنے والے تھے، انھوں نے جن لوگوں سے روایت کی ہے، اور جنھوں نے ان سے روایت کی ہے، ان کے نام بھی دیئے ہیں، جہاں تک سلیمان ابن ابی المغیرۃ کا تعلق ہے وہ نسب کے اعتبار سے عبسی تھے، اور کوفہ کے رہنے والے تھے، انھوں نے جن لوگوں سے روایت کی ہے، اور جنھوں نے ان سے روایت کی ہے، ان کے نام بھی نقل کردیئے ہیں، اس کے بعد ایسے رواۃ کے حالات لکھے ہیں، جن کے نام معدان اور سیف کے مانند دونوں طرح لئے جاتے ہیں، یعنی جب ان کی ولدیت بیان کی جاتی ہے تو اس میں بعض لوگ "ابی" کا اضافہ کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے ہیں، اس میں انھوں نے رواۃ کے زمانے کے تقدم اور تاخر کا لحاظ رکھا ہے اور لکھا ہے "وبدأت بالأقدم فالأقدم منهم" عام طور سے ان کے حالات میں صرف اسی

اکتفا کیا ہے کہ جن لوگوں سے انھوں نے روایت کی ہے، اور جنھوں نے ان سے روایت کی ہے، ان کے نام لکھ دیئے ہیں، لیکن بعض صورتوں میں بعض دوسری باتوں کی طرف بھی توجہ کی ہے مثلاً الحسن بن زید المعروف بالقوی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا لقب "قوی" اس وجہ سے پڑ گیا تھا کہ انھیں عبادت پر قوت حاصل تھی، ایسے رواۃ کے حالات مکمل کرنے کے بعد اُن رواۃ کے حالات لکھے ہیں، جو سلیمان بن المغیرۃ اور سلیمان بن ابی المغیرۃ کی مانند مختلف اشخاص ہیں، ایسے رواۃ کی فہرست زیادہ طویل ہے، اور ان کے حالات خطیب نے حروف تہجی کے اعتبار سے لکھے ہیں انکے حالات لکھنے کا انداز بھی وہی ہے، جو پہلی قسم کے رواۃ کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے، کتاب کے آخر میں ایک عنوان قائم کیا ہے "ومن ذکر ممن غلبت کنیته علی اسمه" اس عنوان کے تحت صرف ابوبکر بن شیبۃ اور ابوبکر بن ابی شیبہ کے حالات ملتے ہیں، حال میں مکتبۂ آصفیہ کے نسخہ کی زیارت کا موقع بھی ملا، اسکی ضخامت ۲۹۳ صفحات ہے، اور ہر صفحے پر ۹ سطریں ہیں سائز ۸×۷ ہے، خط نستعلیق صاف ہے، کتاب کے آخر میں لکھا ہے۔

آخر الکتاب ... نا قلا عن النسخة المنقولة عن نسخة مدینة مکتوبة فی البلدة حیدرآباد الجنوبی یوم الأحد ثالث رمضان المعظم سنة ۱۳۳۵ھ الهجریة علی صاحبها الف صلوٰة وتحیة وأنا المذنب الراجی رحمة الله القوی زین العابدین الآروی البهاری غفر الله له۔

نسخے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

الحمد لله الذی أوضح سبیل الرشاد برحمته ووفق لاتباع الهدی من شاء من خلیقته وصلاة الله وسلامه علی عباده الذین اصطفی وخص بالفضل ذلک نبینا محمد سید الوری۔

اس کے بعد وہی عبارت ہے جو حبیب گنج کے نسخے میں ہے۔

امام مزنی

از

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

(۲)

مزنی سے التفات خاص، گفتگو میں مزاح کا رنگ

امام مزنی، امام شافعی کے اس قدر قریب، مزاج شناس، اور چہیتے شاگرد تھے، کہ وہ اپنی ثقاہت ومتانت اور تمکین و وقار کے باوجود کبھی کبھی ان سے گفتگو میں غایت محبت و فرط التفات کی بنا پر مزاح کی چاشنی بھی شامل کر دیتے تھے، ایک بار مزنی سے فرمایا میں نے مدینہ میں چار عجیب و غریب چیزیں دیکھیں، ایک تو اکیس برس کی دادی دوسری ایک ایسا شخص جسے قاضی نے دو مد کھجور کی گٹھلیوں کے بارے میں مفلس قرار دیا، تیسری نوے برس کا ایک پیر فرتوت جو دن بھر ننگے پاؤں کنیزوں کے پاس گانے کی تعلیم دینے کے لیے آتا جاتا رہتا تھا، لیکن جب نماز پڑھتا تو بیٹھ کر، چوتھی چیز کے بارے میں میں بھول گیا، ایک مرتبہ مزنی سے فرمایا، میں چالیس برس تک شادی شدہ مردوں سے

ازدواجی زندگی کے بارے میں ان کا رد و عمل معلوم کرتا رہا، لیکن کسی ایک نے بھی اس تجربہ کے بارے میں کلمۂ خیر نہ کہا،

ایک بار مزنی کے سامنے

انا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر۔

کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمایا کہ

ما تقدم من ذنبک سے مراد ذنب آدم اور ما تاخر سے مراد ذنوب امت ہیں، بیہقی نے احکام القرآن میں اس قول کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ھذا القول مستظرف[۱] (یہ قول لطیف ہے) امام شافعی کے اس التفات خاص اور فرط محبت کے باب میں کوئی بھی امام مزنی کا ہمسر نہیں ہے۔

استاد کے بارے میں مزنی کے تاثرات

امام شافعی کی دل آویز شخصیت اور ان کے انداز دلنوازی و دلداری کا یہ اثر تھا کہ امام مزنی عمر بھر اپنے محبوب و مرشد استاذ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے، فرماتے تھے،

لو وزن عقل الشافعی بعقل نصف اهل الارض لرجح[۲]

اگر امام شافعی کی عقل کو زمین کے آدھے لوگوں کی عقل سے وزن کیا جائے، تو امام صاحب کی عقل زیادہ وزنی ثابت ہوگی

۱؎ طبقات السبکی ج ۱ ص ۲۲۱ ۲؎ مرآۃ الجنان ا: یافعی مالکی ج ۲ ص ۱۹

ایک بار فرمایا، اگر تم لوگ امام شافعی کو دیکھتے تو ان کی کتابوں کے بارے میں کہتے کہ ان کی تصانیف نہیں، خدا کی قسم ان کی زبان ان کی کتابوں سے بڑھ کر تھی،[1]

وہ اپنے استاد کی شان میں کسی قسم کی تنقید یا تنقیص گوارا نہیں کر سکتے تھے، ایک موقع پر فرمایا، خدا کی مخلوق میں میں کسی سے بھی اس بات پر بحث کر سکتا ہوں کہ امام شافعی کی کتابوں میں جو غلطیاں پائی جاتی ہیں وہ ناقل کی ہیں امام شافعی کی نہیں ہیں،[2]

تقویٰ وعبادت امام شافعی سے اس عقیدت اور ذہنی وابستگی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے عبادات و معاملات، زہد و ورع، جود و سخا، صبر و توکل اور قناعت و بے نیازی ہر چیز میں ان کی جھلک نظر آتی ہے، وہ خود فرماتے ہیں، انا خلق من اخلاق الشافعی اس جھلک کا کچھ اندازہ عمرو بن عثمان مکی کے مندرجۂ ذیل الفاظ سے ہو سکتا ہے،

ما رایت احداً فی المتعبدین	میں بہت سے عابدوں زاہدوں سے
فی کثرۃ من لقیت منہم	ملا لیکن کسی کو بھی قوت اجتہاد عبادت
اشد اجتہادا علی المزنی	کی مواظبت، علم اور اہل علم کی تعظیم
ولا ادوم علی العبادۃ	میں مزنی سے بڑھ کر نہیں پایا
منہ وما رأیت احداً اشد	وہ تقویٰ کے اعتبار سے اپنے نفس پر
تعظیما للعلم واہلہ منہ	سب سے زیادہ سخت تھے، لیکن اور
وکان من اشد الناس	دوسرے لوگوں کے معاملہ میں بڑے
تضیقا علی نفسہ فی الورع	وسیع النفس تھے،
واوسعہ فی ذلک علی الناس[3]	

[1] مراۃ الجنان ج ۲ ص ۱۹ [2] الانتقاء ص ۸۹ [3] طبقات ۔ سبکی ج ۱ ص ۲۳۸

علامہ سبکی نے انھیں زاھداً ورعا متقللامن الدنیا، مجاب الدعوۃ (زاہد، متقی، دنیا سے کم لینے والے اور مقبول و مستجاب) کے الفاظ سے یاد کیا ہے،[1] تقریباً سارے اصحاب طبقات و مورخین ان کی ان صفات پر متفق ہیں، تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی ایک وقت کی نماز جماعت سے نہ ادا ہو پاتی، تو اسے علحدہ پچیس بار ادا کرتے اور آنحضرتؐ کا یہ ارشاد گرامی پیش کرتے، صلاۃ الجماعۃ افضل من صلوۃ احدکم وحدہ بخمس وعشرین درجۃ (جماعت سے نماز کی ادائی تمھاری تنہا نماز سے پچیس گنا افضل ہے[2])

احتیاطاً اس قدر ملحوظ رکھتے کہ سال کے ہر موسم میں تانبہ کی کٹوریوں میں پانی پیتے، مٹی کے کوزوں میں اس لیے نہ پیتے کہ ان کو پکانے میں گوبر کا استعمال ہوتا تھا، اور ان کے مسلک کے لحاظ سے آگ اسے پاک نہیں کر سکتی۔[3]

مُردوں کو خالص ثواب کی نیت سے غسل دیتے اور فرماتے ایسا اس لیے کرتا ہوں کہ دل سوز و رقت سے خالی نہ ہو، امام شافعی کو غسل دینے کی قابل رشک سعادت بھی انھیں کے حصہ میں آئی۔[4]

قضاعی نے لکھا ہے،

لم یکن احد من اصحاب	اصحاب شافعی میں سے کوئی بھی
الشافعی یحدث نفسہ	کسی معاملہ میں ان پر سبقت کا
بالتقدم علیہ فی شی	دعویٰ نہیں کر سکتا تھا،
من الاشیاء،[5]	

[1] وفیات الاعیان ص ۱۲۵ [2] طبقات ۔ سبکی ج ۱ ص ۲۲۹ [3] مراۃ الجنان ج ۲ ص ۱۰۱ [4] العقد المذہب ابن ملقن قلمی، خدابخش لائبریری پٹنہ

ابن یونس نے انھیں احد الزهاد فی الدنیا و من خیر خلق اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

زہد، گوشہ نشینی استغنا

ان کے زمانہ میں مصر کے فرمان روا احمد بن طولون تھے، جو اپنی شجاعت، اولو العزمی، عدل اور سخاوت کے علاوہ علم شناسی اور علماء کی قدر دانی میں بہت نیک نام تھے، ان کے دربار میں اہل فضل وکمال کی کثرت و تابانی سے کہکشاں کا سماں نظر آتا تھا، لیکن اس دربار میں امام مزنی شاذ و نادر ہی جلوہ گر ہوتے، اس کی وجہ ان کی طبعی زہد پسندی اور گوشہ نشینی تھی، صرف ایک بار مسئلہ قضاء علی الغائب کے سلسلہ میں وہ ابن طولون کی مجلس میں تشریف لائے تھے،

قاضی بکار بن قتیبہ جو اپنے منصب کے علاوہ ایک بڑے عالم اور حنفی فقیہ تھے، جب بغداد سے مصر عہدۂ قضا کے لیے آئے تو امام مزنی سے ملاقات وگفتگو کی خواہش بھی انکے دل میں تھی، لیکن عرصۂ دراز تک یکجائی کا موقع نہ ملا، ایک شہادت کے سلسلہ میں جب امام مزنی، قاضی بکار کی مجلس میں تشریف لائے اور اپنا نام بتایا تو قاضی بکار نے حیرت سے پوچھا کہ وہی مزنی جو صاحب الشافعی ہیں، فرمایا، ہاں، قاضی بکار کو بمشکل یقین آیا، ابو عمر کندی نے اس واقعہ کے ضمن میں صراحت کردی ہے کہ لم یکن رآہ قبلها لاشتغال المزنی بنفسہ[1]

لم یکن رآہ قبلها لاشتغال المزنی بنفسہ[1] — اس سے پہلے نہ دیکھ سکنے کی وجہ مزنی کا ذاتی اشتغال تھا،

ایک بار پھر اتفاق سے ایک جنازہ میں ان دونوں حضرات کا اجتماع ہوا، قاضی بکار نے اپنے ایک رفیق ابوجعفر التس سے کہا، مزنی سے کچھ سوال کرو کہ ان کی گفتگو سے بہرہ ور ہو سکوں، ابوجعفر نے نبیذ کے مختلف فیہ مسئلہ کو چھیڑ دیا، اور پوچھا کہ

[1] کتاب الولاۃ والقضاۃ، ابو عمرو کندی ص ۵۰۸،

نبیذ کی تحریم و تحلیل دونوں سے متعلق احادیث موجود ہیں، تو پھر آپ تحریم کو تحلیل پر کیوں مقدم کرتے ہیں، امام مزنی نے فرمایا کسی عالم نے یہ نہیں کہا کہ دور جاہلیت میں نبیذ حرام تھی، اور ہمارے لیے حلال ہوئی، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جاہلیت میں وہ حلال تھی اس سے خود تحریم کی احادیث کی تائید ہوتی ہے، اس معاملہ میں انھوں نے النہی بعد الاباحۃ (ممانعت اباحت کے بعد ہوتی ہی) کے اصول سے استدلال کیا، جو سراسر بے ساختہ ذہانت اور قوت استدلال کے اس مظاہرہ سے قاضی بکار متاثر و مسرور ہوئے اور کہا کہ دلیل قاطع کی یہ بہترین مثال ہے[1]

امام مزنی کی قناعت پسند اور مستغنی طبیعت سے واقف ہونے کے بعد یہ بات باعث حیرت نہیں رہتی کہ وہ دور معتصم سے عہد متوکل تک کسی بھی خلیفہ، وزیر، امیر یا کسی بھی اہل منصب سے وابستہ نہیں تھے، اور مصر میں اپنے گوشۂ علم سے جدا ہو کر وہ کسی دوسرے دربار یا دیار کے سفر حتی کہ سفر حج کے کاروانوں میں بھی تلاش بسیار کے باوجود نہیں نظر آتے،

امام مزنی اور فتنہ خلق قرآن

ان کی خاموش اور گوشہ گیر طبیعت نے تمام مشاغل سے علاحدہ رہ کر صرف فقہ کی تعلیم و تدریس اور اشاعت و ترویج تک اپنے کو محدود رکھا تھا، لیکن اس کے باوجود ان کا دامن فتنۂ خلق قرآن کی لپٹ سے محفوظ نہ رہ سکا ان کے مصری رفیق درس امام ابو یعقوب بویطی نے جن کے بارے میں امام شافعی کی پیشین گوئی کا ذکر ہو چکا ہے، اس فتنہ کا شکار ہو کر امام احمد بن حنبل کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور بالآخر اسی قید کے عالم میں انکی روح قفس عنصری سے

[1] مراۃ الجنان، یافعی مالکی ج ۲ ص ۱۱۰

آزاد ہو گئی، ایسے پر آشوب زمانہ میں امام مزنی کے درس و تدریس میں انہماک اور ان کی احتیاط و خاموشی سے ایک طرف ان کے دوست بویطی کو شکایت رہی کہ اس سے معتزلہ کی ہمت افزائی ہوئی اور ان کے ہاتھوں اہل حق کو مصائب میں مبتلا ہونا پڑا، دوسری طرف بعض لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ وہ خلق قرآن کے قائل ہیں،

وکان من یعادیہ و ینافسہ — ان کے بعض بصری معاندین و منافسین ان
من اہل مصر یرمونہ — پر الزام لگاتے تھے کہ وہ کہتے ہیں
بانہ کان یقول — قرآن مخلوق ہے حالانکہ ان کے بارے
القرآن مخلوق وھذا — میں یہ خیال صحیح نہیں،
لا یصح عنہ[۱]

لیکن یہ سب حاسدین و معاندین کی کارستانی ہے، مشہور ہے، کل ذی مال محسود، امام مزنی معتزلہ کی موافقت کیسے کر سکتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ وہ خود کو اس میدان کا مرد نہیں سمجھتے تھے، لیکن صاحبان ہمت و عزیمت کے مداح تھے، امام احمد بن حنبل کے بارے میں ان کا یہ قول ضرب المثل کی حد تک مشہور ہو چکا ہے،

ابوبکر یوم الردۃ و عمر — حضرت ابوبکر مرتدین (کے بارے میں
یوم السقیفۃ و عثمان یوم — فیصلہ) کے دن، حضرت عمر سقیفہ کے
الدار و علی یوم الصفین — دن، حضرت عثمان شہادت کے دن
و احمد بن حنبل یوم المحنۃ[۲] — اور حضرت علی جنگ صفین کے دن اور
احمد بن حنبل (فتنہ خلق قرآن کے سبب)[۲]

۱؎ انتقاء، ص ۱۱۱ ۲؎ طبقات، سبکی ص ۲۰۰

کسی بھی ابتلاء و آزمائش کے زمانہ میں لوگوں کو غلط فہمیاں ہو ہی جاتی ہیں جن سے غلط بیانیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اس معاملہ میں بھی یہی ہوا، امام مزنی کی مجالس میں شرکت بہت کم ہو گئی، جعفر بن جدار کاتب نے اسی موقع پر کہا تھا،

والمزنی الذی الیہ — نعشوا اذا دھرنا ادلھما

جب سارا زمانہ ہمارے لیے تاریک تھا، تو ہم مزنی کی پناہ دیتا تھے.

اس نازک موقع پر تائید غیبی ان کے کام آئی، ایک مرد صالح جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ابدال میں سے ہیں، ایک صبح جامع مصر میں کھڑے ہوئے لوگوں کو جمع کیا، اور فرمایا، تم سب غلطی پر ہو، توبہ استغفار سے کام لو، میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمہاری اسی مسجد میں ہوں، مسجد کی ساری قندیلیں سوائے ایک قندیل کے گل ہیں، اور یہ قندیل وہیں ہے، جہاں امام مزنی کی نشست ہے، علامہ ابن عبدالبر اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں،

فتوافی الناس الیہ — لوگ ان کی خدمت میں پھر حاضر
واستحبوہ وعظمت حلقتہ — ہوئے ان سے محبت کا معاملہ کیا
حتی اخذت اکثر الجامع — ان کا حلقہ درس بہت وسیع ہو گیا،
وزال ما فی قلوب الناس — یہاں تک کہ جامع مصر کا بیشتر حصہ
من التہمۃ لہ[۱] — اس کی وسعت میں آ گیا، لوگوں کے
دلوں سے ان پر لگی ہوئی تہمت دور

وفات ۲۴ رمضان المبارک ۲۶۴ھ میں امام شافعی کا یہ مایہ ناز شاگرد اور[۲]

۱؎ انتقاء، ص ۱۱۱ ۲؎ ابن عبدالبر کی روایت کے مطابق ۲۶، ربیع الاول ۲۶۳ھ میں انتقال ہوا۔

فقہ شافعی کا رکن رکین ۸۰ برس تک ایک عالم کو فیضیاب کرنے کے بعد اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو گیا، ان کے رفیق اور رضاعی بھائی، امام ربیع بن سلیمان مرادی نے نماز جنازہ پڑھائی، اور مصر کے مشہور قبرستان قرافہ صغری[1] مین امام شافعی کے مزار کے قریب تدفین عمل میں آئی، امام شافعی کا مزار، قرافہ کے مشہور ترین مزارات میں ہے، ایک بار امام مزنی جب وہاں سے گزرے تھے، تو یہ اشعار ان کی زبان پر آگئے تھے[2]

سقی اللہ ھذا القبر من وبل مزنۃ   من العفو ما یغنیہ عن طل المزن

لقد کان کفوا للعلاء و معقلا   وکنا لھذا الدین بل ایما رکن[3]

ترجمہ

اللہ تعالےٰ اس قبر کو اپنے ابر عفو و کرم سے اتنا سیراب کرے کہ شبنم افشانی کا شکوہ نہ رہے وہ (صاحب قبر) بلندیوں اور عظمتوں کے ہمسر اور اس دین کے ستون تھے،

مقریزی کا بیان ہے کہ امام مزنی کی تدفین کے بعد جب ایک شخص کا گزر ان کی قبر کے پاس سے ہوا تو اس نے سنا کہ کوئی غیبی آواز یہی اشعار پڑھ رہی تھی۔

---

[1] قرافہ مصر کا مشہور قبرستان تھا، یہ آب و ہوا کے لحاظ سے بہت خوشگوار تھا، جامع قرافہ مین روسا شہر جمعہ کی راتوں مین شب گزاری اور چاندنی راتوں سے لطف اندوزی کے لیے یہاں برابر آیا کرتے تھے، اسی وجہ سے کھانے پینے کی دوکانیں بھی کثرت سے موجود تھیں، ایک صاحب موسیٰ بن محمد نے اپنی شب بیداریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے، چاندنی راتوں میں قرافہ کی طرب انگیزی قابل دید ہوا کرتی تھی، ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ان القرافۃ قد حوت من ضدین   دنیا واخری فھی نعم المنزل

---

[2] خطط مقریزی ص ۳۴۴

تلامذہ

امام مزنی کے سرچشمۂ علم و فضل سے یوں تو ایک مخلوق نے تشنگی بجھائی، لیکن چند خوش نصیب ایسے بھی ہیں جنھیں دل بھر کر سیرابی کا موقع ملا، یہ اصحاب بعد میں بجائے خود علم و ارشاد کے بحر بیکراں بن گئے، انماطی، عبدان بن محمد، ابوبکر فارسی، ابراہیم بلدی، ابن خزیمہ اور طحاوی، زکریا ساجی، ابن حوصا، ابن ابی حاتم اسی خرمن علم و کمال کے خوشہ چین ہیں۔

عثمان بن سعید انماطی، (م ۲۸۸ھ) اسی طرح صاحب المزنی کہلاتے ہیں جسطرح امام مزنی کا خطاب صاحب الشافعی ہے، خطیب بغدادی نے انھیں شوافع کے ممتاز ترین فقہا میں شمار کیا ہے، ابو عاصم کا قول ہے کہ اہل بغداد کے لیے انماطی کی وہی حیثیت ہے جو اہل نیشاپور کے لیے ابوبکر بن اسحاق کی ہے، کیونکہ یہ ان اولین لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے مزنی کا علم اپنے اپنے علاقوں میں عام کیا[1]

ابویحییٰ زکریا ساجی، بصرہ میں امام مزنی کے علم کے امین تھے، ان کی کتابوں اختلاف الفقہا، اور علل الحدیث کا ذکر اہمیت کے ساتھ ہوتا ہے[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۲)

کم لیلۃ تبنا بھا و ندیمنا   لحن لکادید و ب منہ الجندل

والبدر قد ملأ البسیطۃ نورہ   فکانما قد فاض منہ جدول

قرافہ دنیا و آخرت کا جامع ہے، وہ بہترین منزل ہے، کتنی ہی راتیں ہم نے وہاں ایسی گزاریں کہ ہمارے ہم مشرب کی نغمہ سرائی سے پہاڑ پگھلتے معلوم ہو رہے تھے، چاند کی کرنوں سے پورا ماحول منور تھا، محسوس ہو رہا تھا کہ چاندی کے آبشار رواں ہیں۔

مقریزی کا قول ہے کہ قرافہ سے بڑھکر شاندار، پر رونق اور صاف ستھرا قبرستان دنیا میں اور کہیں نہیں،

[3] وفیات الاعیان، ابن خلکان ج ۱ ص ۵۸ ۱ طبقات السبکی ج ۲ ص ۵۲ [2] طبقات سبکی ج ۲ ص ۲۲۶

محمد بن خزیمہ نیشاپوری، انھیں امام الائمہ بھی کہا جاتا ہے، امام مزنی کے عزیز ترین شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں، امام مزنی کے متعلق وہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں، جس سے امام مزنی کی شخصیت کی صداقت، سادگی اور علمی انکساری کے ساتھ شاگردوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی عزت نفس کا اظہار ہوتا ہے، ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ میں ایک بار امام مزنی کی خدمت میں حاضر ہوا، مجلس میں ایک شخص نے قتل شبہ عمد کے بارے میں استفسار کیا اور کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں قتل کی دو قسموں قتل عمد اور قتل خطا کا ذکر کیا ہے، تو آپ ایک تیسری قسم قتل شبہ عمد کا اضافہ کیوں کرتے ہیں، جواب میں امام مزنی نے حدیث بیان کی تو سائل نے دریافت کیا کیا آپ علی بن زید بن جدعان کی روایت سے استدلال کر رہے ہیں، اس پر امام مزنی خاموش رہے تو میں نے کہا کہ اس روایت کو علی بن زید کے علاوہ ایوب سختیانی اور خالد الحذار نے روایت کیا ہے، سائل نے پھر پوچھا عقبہ بن اوس کون ہیں تو میں نے کہا عقبہ بن اوس بصرہ کے رہنے والے ہیں، اور امام محمد بن سیرین نے باوجود اپنی جلالت شان کے ان سے روایت کی ہے، میرے ان جوابات پر سائل نے امام مزنی سے کہا آپ مناظرہ کر رہے ہیں یا یہ؟ امام مزنی نے فرمایا جب حدیث کی بات آئے گی تو یہی مناظرہ کریں گے، کیونکہ وہ مجھ سے بہتر علم حدیث سے واقف ہیں۔

امام طحاوی، امام مزنی کے شاگرد اور خواہر زادہ ہیں، ابتدا میں فقہ کی تحصیل اپنے ماموں امام مزنی سے کی، امام طحاوی نے امام ابو حنیفہ کی کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا، اس لیے طبعاً فقہ حنفی کی جانب میلان تھا، امام مزنی کی نشستوں میں بھی وہ فقہ حنفی اور فقہ شافعی کی کشمکش میں مبتلا رہتے، کبھی کبھی انھیں اپنے اعتراضات اور

اشکالات کے جواب سے تشفی نہ ہوتی، اسی سلسلہ میں یہ روایت بہت مشہور ہے کہ ایک روز امام مزنی نے ان سے کہا واللہ لاجاء منك شئى، خدا کی قسم تم سے کچھ نہ ہوگا طحاوی نے اس پر ناراض ہو کر انکے یہاں کی نشست کو ترک کر دیا، اور اس کے بعد جب اپنی کتاب مختصر طحاوی تصنیف کی اور ان کے علم و فضل کا شہرہ ہوا، تو فرمایا۔ رحم اللہ ابا ابراھیم لو کان حیاً درای لکفر عن یمینہ (اللہ ابو ابراہیم (مزنی) پر رحم فرمائے، اگر زندہ ہوتے اور مجھے دیکھتے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرتے۔[۱] امام طحاوی علمی کمال کے ساتھ غیر معمولی ذہین بھی تھے، اور ان کی کتابیں انکی فطری ذہانت کی غماز ہیں مطالعہ کے دوران ان کے سامنے امام ابو حنیفہ اور ان کے نامور شاگردوں کے خیالات ...... اور دلائل آتے تھے، اس بنا پر وہ احناف کی قوت استدلال سے بہت متاثر تھے، اور دوران درس اس کا تذکرہ کرتے تھے، امام مزنی نے انھیں بہتیرا سمجھایا مگر وہ اس سے متاثر نہ ہوئے اور احناف کی طرف ان کا رجحان بڑھتا گیا، بالآخر وہ نامور علمائے احناف میں شمار ہوئے۔

تصانیف | کسی بھی شخص کی اہمیت و افادیت کا صحیح اندازہ اس کے شاگردوں اور تصانیف سے کیا جا سکتا ہے، امام مزنی کو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں ممتاز کیا تھا، ان کی تصانیف میں جامع کبیر، جامع صغیر، مختصر المختصر، المنثور، المسائل المعتبرۃ، الترغیب فی العلم، کتاب الوثائق، کتاب العقارب، نہایۃ الاختصار وغیرہ کا ذکر ملتا ہے،[۲] لیکن ان ساری کتابوں میں مختصر المزنی کو جو شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی، وہ

[۱] وفیات الاعیان ص ۱۲۲ [۲] الیفاً ص ۱۲، طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۳۸، کشف الظنون ص ۲۶۸۰۲، الفہرست ابن ندیم ص ۲۹۹

بے مثال ہے، فقہ شافعی کی ترویج میں اس کتاب سے بڑھ کر کسی کتاب کا بھی حصہ نہیں رہا، علامہ ابن سبکی نے اس کتاب کی تعریف میں لکھا ہے۔

انه زينة مذهبكم	یہ (کتاب) تمھارے مسلک کی
وعمدة اصلكم وقاعدة	زینت، تمھارا بنیادی ستون اور
طريقكم وموئلكم حين	سنگ میل ہے، تمھارے اختلافی مسائل
تختلفون ومرجعكم	میں تادیل گاہ اور تمھارے پیچیدہ
حين تضطربون ومفزعكم	مسائل میں مرجع ہے، جب مختلف
حين تضطرب امواج	رایوں کا ہجوم اور فقہاء کی محفلوں
الآراء وتتناصى في	میں منازعہ ہو تو وہ تمھارے لیے
محافل الفقهاء[1]	جائے پناہ ہے۔

ابو العباس بن سریج نے ایک موقع پر مختصر المزنی کی تعریف میں یہ اشعار پڑھے[2]

لتضييق فؤادي منذ عشرين حجة	وصيقل ذهني والمفرج عن همي
عزيز على مثلي اعارة مثله	لما فيه من علم لطيف ومن نظم
جموع لاصناف العلوم باسرها	فاخلق به أن لا يفارقه كمي

تقریباً بیس سال سے میرے دل کی تنگی دور کرنے کے لیے اور ذہن کو جلا بخشنے کے لیے اور میری فکروں کو دور کرنے کے لیے (یہ کتاب کام آرہی ہے) اس کے علم لطیف اور دلکش ترتیب کی وجہ سے اسے کسی دوسرے کو دینا مجھ پر شاق ہے، یہ تمام علوم کی جامع ہے، اور اس لائق ہے کہ میرے ہاتھوں سے جدا نہ ہو۔

۱ طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۳۸، ۲ ایضاً ج ۲ ص ۲۸

امام ذہبی کی روایت ہے کہ قاضی ابوزرعہ نے ہر اس شخص کے لیے جو مختصر المزنی کو حفظ کرے ایک سو دینار کا انعام مقرر کیا تھا[1]۔

مختصر کی قبولیت کا اندازہ اس کی شرحوں سے بھی ہو سکتا ہے، آنے والے دور میں بہت سے ممتاز شافعی فقہاء نے اس کی شرحیں لکھیں جن میں ابو العباس ابن سریج کی شرح زیادہ مستند ہے، اور مقبول ہے، اس کے علاوہ ابو الطیب طبری ابو اسحٰق مروزی، ابو حامد مروزی، ابو عبد اللہ مسعودی، ابو بکر الشاشی، ابو علی سنجی، ابن علان کتانی، قاضی زکریا بن محمد انصاری وغیرہ کی شروح و تعلیقات بھی نمایاں ہیں، صاحب کشف الظنون نے ایک طویل فہرست ان شارحین کی بیان کی ہے[2]۔ اس کتاب کی اہمیت ایک الگ مضمون کا تقاضا کرتی ہے، بہت سے مسائل و مباحث ایسے ہیں جن میں امام مزنی نے امام شافعی سے اختلاف بھی کیا ہے اسی بنا پر بعض شوافع نے انھیں خود ایک الگ مسلک کا حامل قرار دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اصول شافعی سے اختلاف نہیں کرتے۔

۱ کتاب الولاۃ والقضاۃ ص ۵۲۲ ۲ کشف الظنون ص ۲۸۱

تلخیص و تبصرہ

مستشرقین اور تحقیقاتِ اسلامی

مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی کا ایک کتابچہ مستشرقین اور ان کے کاموں اور ارادوں کے بارے میں کراچی سے شایع ہوا ہے۔ جس میں مولانا نے بڑی خوش اسلوبی سے مستشرقین اور ان کے کارناموں کی حقیقت کا پردہ فاش کیا ہے، ذیل کی سطور میں اس کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔ (ع ۔ ص)

مستشرقین یورپ کی اسلامی تحقیقات کو ہم سہولت مطالعہ کے لیے چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ پہلا دور ابتدائے تاریخ اسلامی یعنی ساتویں صدی مسیحی یا گریگوری سے لیکر پندرہویں صدی مسیحی یعنی بیداری یورپ تک

۲۔ دوسرا دور، پندرہویں صدی کی ابتدا سے اٹھارویں صدی کے اختتام تک

۳۔ تیسرا دور، انیسویں صدی کی ابتدا سے بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے ختم یعنی ۱۹۲۵ء تک۔

۴۔ چوتھا دور، ۱۹۲۶ء سے آج تک

دور اول، یہ دور تقریباً آٹھ سو برس کے طویل زمانہ پر مشتمل ہے، اس دور میں یورپ کی ساری علمی زندگی پر ارباب کلیسا کا قبضہ تھا، پاپائے اعظم اور ان کے نائبین مسلمانوں سے مختلف علوم حاصل کرنے کی سعی کرتے تھے، عربی کتب اور رسائل جمع کرتے تھے، اسلامی قوانین کا تھوڑا بہت مطالعہ اس دور کے آخری حصہ میں کیا گیا، طب، فلسفہ، فلکیات، زراعت، اور قانون پر مسلمانوں کی تصانیف کا ترجمہ لاطینی اور فرنچ زبانوں میں ہوا، ابن رشد اور جابر بن اسحاق اور ابن سینا کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے، یہ کام عموماً ایطالیہ میں اور کسی قدر فرانس میں ہوا۔ لیکن نہایت دانائی کے ساتھ فارابی کو "فارابیس" ابن رشد کو "ایوی رومس" جابر کو "جیبر" اور ابن سینا کو "اوی سینا" بنا دیا گیا، اور طلبہ کو یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ یہ لوگ یورپین عیسائی نہیں بلکہ مسلمان تھے، اس دور میں مسلمانوں اور دین اسلامی سے متعلق بڑے عجیب عجیب ہیبتناک قصے ارباب کلیسا کی طرف سے پھیلائے گئے، مسلمانوں کی سفاکی اور قرآن مجید اور رسول اللہؐ کے متعلق بے سروپا افسانے خوب خوب گھڑے گئے، اور اسی زمانہ میں یورپ والوں کو یہ باور کرایا گیا کہ مسلمان مکہ میں رسول اللہؐ کے برنجی بت کو سجدہ کرنے کے لیے جایا کرتے ہیں۔

اس زمانہ کے اجلہ مستشرقین میں سب سے اول نام "جربردی اولیاک" ایک فرانسیسی راہب کا ملتا ہے، یہ فرانس میں ۹۳۰ء میں پیدا ہوا، ۱۰۰۳ء میں بمقام ویٹیکن وفات پائی، اس نے اندلس کے مدارس میں برسوں رہ کر تعلیم حاصل کی اور اپنی قابلیت کی وجہ سے واپس آکر فرانس و ایطالیہ میں بڑا نام پیدا کیا، واپسی پر وہ ایطالیہ میں مستقل اقامت گزیں رہا، حتیٰ کہ ۹۹۹ء میں وہ پاپائے اعظم کے جلیل القدر عہدہ پر

قائم ہوا، اس نے دو عربی مدرسے قائم کئے، اور فلکیات و ریاضیات کی بعض کتابوں کے عربی سے ترجمے بھی شائع کیے، اس کے تراجم و تصانیف کا مجموعہ ۱۸۹۹ء میں برلن سے شائع ہوا (نجیب العقیقی، المستشرقون) ج ۱ ص ۱۲۰ طبع مصر ۱۹۶۴ء)

اس دور کے مستشرقین میں "اور لیانک" کے علاوہ قسطنطین الافریقی المتوفی ۱۰۸۷ء ادجودی سانتا، ڈی کویل، ایڈیلارڈ، پطرس، یوحنا رابرٹ، ہرمان، ڈینیل مورلے میکل اسکاٹ، لیونارڈ، تھامس ڈی اکوین، روجر بیکن اور رینڈ لیو وغیرہ کے نام ملتے ہیں، یہ سب اندلس، صقلیہ اور دیگر اسلامی ممالک کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں، اور بہت سی عربی کتابوں کے فرنچ، اور لاطینی زبانوں میں ترجمے کئے ہیں، تقریباً یہ سب راہب یا کلیسا کے خدام ہیں، اسی دور کا ایک بڑا فاضل اے تورمیدا ہے جس نے ایطالیہ میں تعلیم حاصل کی، بہت دنوں تک عیسائی خانقاہ کا مرشد اعلیٰ رہا، اس کے بعد تونس چلا گیا، وہاں صدق دل سے مسلمان ہوگیا، اور عبداللہ کے نام سے مشہور ہوا وہیں تقریباً اسی سال کی عمر میں ۱۴۳۲ء میں وفات پائی، اس کی قبر تونس میں باب المنارہ میں ہے۔ (حوالہ سابق ۱۳۲ء)

عبداللہ تورمیدا کے علاوہ اور بہت سے اطالوی اور فرنچ مستشرقین نے مطالعہ کے ذریعہ دین حق کو پالیا اور مسلمان ہوگئے، ان میں سے بعض نے اسلام پر لاطینی اور فرنچ میں کچھ رسالے بھی لکھے تھے، خدا جانے یہ رسالے اب کہیں موجود ہیں یا ضایع کر دیے گئے۔

دوسرا دور جو یورپ کی بیداری پندرہویں صدی مسیحی سے اٹھارویں صدی کے ختم تک تقریباً ۴۰۰ سال پر مشتمل ہے، دولت عثمانیہ ترکیہ کی اقبال مندی کا زمانہ ہے ۱۴۵۳ء میں

قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا، اور بہت سے ممالک یورپ عثمانیوں کے زیرنگیں آگئے، دوسری طرف یورپ میں عام بیداری پیدا ہوئی، کلیسا کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا، ہر طرح کی سیاسی، تعلیمی اور سماجی اصلاحات شروع ہوئیں، ان سب کا لب ولہجہ اسلام کے خلاف تلخ ہی تھا، یہ تلخی عثمانی فتوحات کے خلاف جذبات نفرت کی پیداوار ہے، اس دور میں علماء یورپ نے ڈھونڈ کر عربی کتابوں کے قلمی نسخے نکالے اور ان کو طبع کر کے شایع کیا، ان کے ترجمے کیے، اور اس کے لیے بادشاہوں نے خزانوں کے در کھول دیئے، عالموں نے عمریں وقف کیں، خود یورپین زبانوں میں اسلام پر بہ کثرت کتابیں لکھی گئیں اور مطبع کی ایجاد نے ان کتابوں کی بہ کثرت اشاعت کو آسان کر دیا، اسی دور میں یورپین اقوام نے مشرق کی سرزمین ایشیا و افریقہ پر قبضہ جمایا، جن علاقوں پر ان استعمار پسندوں نے قبضہ کیا تھا، ان میں سے اکثر میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت کی آبادیاں تھیں، قبضہ اور تسلط قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ان کی زبانیں سیکھی جائیں، ان کے عقائد و روایات سے واقفیت حاصل کی جائے، ان کو آپس کے اختلافات میں الجھایا جائے ان میں مذہبی تقشف کو کم کرنے کے لیے ان کے یقین کو شک سے بدل دیا جائے، ان کے ایمان و عقیدہ کو وہم اور غیر ثابت شدہ حقیقت قرار دیا جائے، ان مقاصد کے لیے یورپین ممالک خصوصاً فرانس و جرمنی نے بڑی جدوجہد کی، اس وقت ان کے سامنے اہم مسئلہ یہ بھی تھا کہ دولتِ عثمانیہ کی قوت کو کس طرح توڑا جائے، اس کام کے لیے یہ ضروری تھا کہ عربوں اور ترکوں کے مابین منافرت اور دشمنی پیدا کر دی جائے، اور اس منافرت کو دوامی صورت دیدی جائے، اس مقصد کے لیے فرانس کے بادشاہ لوئیس چہاردہم نے بے دریغ

دولت صرف کی، مستشرقین اور مشرق شناسوں کو بڑی بڑی رقمیں دیکر ان سے عربی قومیت، عربی تمدن، عربی رسم و رواج اور عربوں سے متعلق دوسرے امور پر کتابیں لکھوائی گئیں، عربوں کی تعریف و توصیف کے گیت گائے گئے، مستشرقین کا ایک بڑا طبقہ یہ باور کرا رہا تھا کہ اسلام سے پہلے ہی عرب بڑی عزت و شان کے مالک تھے، اسلامی تاریخ عربوں کے مجد و شرف کی تاریخ کا محض ایک باب ہے، اب تک جو تاریخیں لکھی جاتی تھیں وہ مسلمانوں کی تاریخ ہوتی تھی، عربوں کی الگ تاریخ کوئی نہیں لکھتا تھا، اب عربی ممالک میں تحقیقاتی وفود کی ابتدا ہوئی، آثار قدیمہ نکالے جانے لگے اور عربوں کو وطنی قومیت کے لیے تیار کیا جانے لگا، جس کا نتیجہ تقریباً سو سال بعد بیسویں صدی کے اوائل میں خاطر خواہ نکلا۔

اس دور کی آخری دو صدیوں میں اسلام کے خلاف کتابوں اور رسالوں کی تالیف و اشاعت کا کام اٹالیہ اور فرانس سے آگے بڑھکر جرمنی اور نیدرلینڈ تک پھیل گیا، آخر میں انگلستان میں تعلیمی اور اشاعتی ادارے قائم ہوئے، اس دور کے مشاہیر مستشرقین میں اولین نام مسٹر جی۔ پوسٹل کا ہے، یہ نارمنڈی کے ایک قصبہ باروٹون میں ۱۵۰۵ء میں پیدا ہوئے، اور ۱۵۹۱ء میں وفات پائی، انھوں نے ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے سفر کیے، بہت سی قلمی کتابیں خریدیں اور عربی و عبرانی زبان دانی اور مسلمانوں کے عقائد و رسوم پر متعدد کتابیں لکھیں، یہ ایک مذہبی پیشوا تھے، ان کے علاوہ اس دور کے مشاہیر مستشرقین میں بی وبیٹبیر (۱۶۶۷-۱۷۱۳) بی ڈی ہربیلو (۱۶۲۵، ۱۶۹۵) انطوان گالان (۱۶۴۶، ۱۷۱۵) پادری رینادوڈو (۱۶۴۶-۱۷۲۰) اور پادری ماریسی (۱۶۱۲-۱۶۹۵) وغیرہ نے اپنے اپنے انداز میں اسلام پر کتابیں لکھیں، یہی وہ زمانہ ہے جب کہ کلیسا کا طلسم ٹوٹا اور کچھ ایسے مستشرقین سامنے آئے جنھوں نے پیشرو مستشرقین

تردید کی لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ نئے شبہات بھی پیدا کر دیئے۔

تیسرا دور انیسویں صدی کی ابتدا سے ۱۹۲۵ء تک ہے، اس دور میں عربی کتابوں کی تصحیح اور اشاعت کا کام زیادہ وسعت کے ساتھ ہوا، اسلامی کتابوں کے ترجمے بکثرت شائع ہوئے، اسلامی تحقیقات کے نام سے مسلمانوں کے اندرونی اختلافات اور جدید فرقِ اسلامیہ پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، عربی قلمی کتابوں کی تشریحی فہرستیں شائع ہوئیں، تقریباً ہر ملک میں ایشیائی سوسائٹیاں وجود میں آئیں، اس دور کے مستشرقین عربی متنوں کی تصحیح اور علوم ریاضیہ و تجربیہ کے تراجم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ دو مقاصد کے لیے کام کرتے نظر آتے ہیں، اول عربوں اور غیر عربوں میں تفریق کے لیے عربوں کی تعریف و توصیف اور غیر عرب مسلمانوں پر الزامات عائد کرنے کا التزام اور دوم مسلمانوں کی روایات اور ان کی تاریخ کو ناقابل اعتبار قرار دینے کی مساعی، اس دور میں قرآن مجید کے متعدد ترجمے ہوئے، قرآن مجید کے الفاظ کی فہرستیں اور لغات القرآن بکثرت تیار کیے گئے، مسٹر جی فلوگل (۱۸۰۲-۱۸۷۰) اور مسٹر ہملٹن (م ۱۸۲۴ء) مترجم ہدایہ اسی دور کے علماء میں ہیں، اس دور کے مستشرقین میں سے ایڈورڈ ریہاٹسک (۱۸۱۹-۱۸۹۱) مسٹر ہیوز مصنف ڈکشنری آف اسلام، تھامس کارلائل، ولیم میوک مارلے، ایڈورڈ ہیلر، ایل اسمنٹ پادری ڈرم، سی، ای، ولسن، گولڈ زیہر، پادری کموشکو، لازیتوں بلاشیر اور نالینو وغیرہم ہیں، مشہور پروفیسر یامر اور ان کے نامی گرامی شاگرد کرنل لارنس آف عربیا اسی دور کے بزرگ ہیں۔

چوتھا دور جو ۱۹۲۶ء میں امیر کا تیانی کی وفات سے اب تک ہے، اس دور میں

تحقیقات اسلامی کا کام جن مستشرقین نے کیا ان میں نولدیکی اور ان کے شاگرد علامہ بروکلمان اور پروفیسر سخاؤ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اسی طرح تھامس آرنلڈ مسٹر جبکین، مونٹ گمری واٹ، مسٹر لیمب، مسٹر انڈوسن، پروفیسر مارگولیتھ، مسٹر لوکارٹ، مسٹر براؤن مسٹر لنڈاؤ اور مسٹر لوئیس وغیرہ ہیں، پادری زویمر م ۱۹۵۲ء بانی رسالہ مسلم ورلڈ بھی اسی دور کے ہیں، جن کے متعلق خود مستشرقین کی یہ رائے ہے کہ ان کے تعصب نے ان کی تصنیفات کا علمی مرتبہ ہی ختم کر دیا، اس دور میں تحقیقات اسلامی کا دائرہ فقہ اور اصول فقہ تک وسیع ہو گیا، فرق اسلامیہ کے حالات اور تصوف اسلامی کی جانب بھی توجہ زیادہ ہوئی۔ اس دور میں بڑی بڑی حکومتیں خدا بیزاری اور مذہب سے نفرت کے جذبہ پر قائم ہوئیں، ۱۹۴۵ء کے بعد تو خدا بیزار مملکتوں کا مسلسل پروپیگنڈا خود عیسائیت بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گیا، اس لیے یورپ کا لب و لہجہ اسلام کے خلاف یاوہ گوئی میں نسبتۃً نرم ہو گیا، اگرچہ پادری سموئیل زویمر اور ان کے ہمنوا پوری قوت کے ساتھ اسلام، قرآن اور رسول اللہ کے خلاف لکھتے رہے۔

مقاصد | کسی ذی ہوش آدمی کا ارادی عمل بغیر مقصد کے ممکن نہیں، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ مستشرقین کا عمل تحقیقات اسلامی کسی مقصد کے بغیر ہوتا رہا ہے، یقیناً یہ ساری محنت اور اتنے بڑے پیمانہ پر کام کوئی مقصد رکھتا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد صرف تلاش علم ہو سکتا ہے، لیکن یہ خیال اس لیے باطل ہو جاتا ہے، کہ ہم قدیم زمانہ سے اس کام میں زیادہ تر ان ہی حضرات کو منہمک پاتے ہیں جو عیسائیت کے پرجوش مبلغ ہیں، ان ناموں پر غور کیجیے یہ سب مسیحی پادری ہیں اور رہ توں مرتاض

راہب رہ کر انھوں نے تربیت پائی ہے۔ پادری البانو ۱۸۶۹ء پادری ریلینڈ ۱۸۴۳ء پادری مارٹن ۱۹۰۰ء پادری لین ۱۸۹۱ء پادری ایوجی ۱۸۹۵ء پادری کوش ۱۸۹۵ء پادری ژی کوپر ۱۹۰۳ء پادری جولیان ۱۹۱۱ء پادری بروبر ۱۹۱۹ء پادری میکارتھی المولود ۱۹۱۳ء پادری برلو مواے ۱۹۲۹ء پادری زیوفین ۱۹۲۶ء پادری مونٹوڈے المولود ۱۹۰۰ء پادری نہری چارلس المولود ۱۹۰۰ء پادری نلیشِ المولود ۱۹۰۲ء یہ سب کلیسا کے مذہبی عہدہ دار ہیں انھیں بیش قرار تنخواہیں کلیسا اور اوقاف کلیسا سے ملتی رہی ہیں، ظاہر ہے کہ ایک مسیحی راہب اور کلیسا کا عہدہ دار، کلیسا کی تنخواہ لے کر اسلام پر تحقیقات کس مقصد اور جذبہ کے ماتحت کر سکتا ہے، عربی زبان سے ریاضیات، فلکیات، کیمیا، طب، نباتات اور حیوانیات کی کتابوں کے ترجمے کرنے والوں کو شاید یہ کہہ دیا جائے کہ محض تلاش علم کے لیے یہ سب کر رہے ہیں، لیکن اسلامی عقائد، اسلامی تاریخ، قرآن حکیم، سیرۃ رسول اور اسلامی تصوف پر تحقیقات کرنے والے ان مسیحی خانقاہ نشینوں اور مبلغوں کا مقصد صرف تلاش علم و ہنر کیسے ہو سکتا ہے، مستشرقین کی تحریروں کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا، استعمار کے لیے راستہ کی ہمواری اور مسلمانوں میں تفریق پھیلانے کی جد و جہد کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا، وہ تحقیق کے نام سے منافقوں اور اسلام دشمن اشخاص کے قدیم اقوال ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہیں اور چونکہ عرب عیسائیوں اور یہودیوں کے اکثر نام مسلمانوں کے سے ہوتے ہیں اس لیے بڑی آسانی کے ساتھ وہ دھوکے دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، مسلمان حکومتوں نے میں ہمیشہ سے آزادی رائے دی گئی ہے، اس لیے ہزاروں یہودیوں اور عیسائیوں

طرح طرح کی فضول اور مضر تحریریں لکھی ہیں، آج یہ تحریریں اس طرح پیش کی جاتی ہیں جیسے کسی مسلمان عالم دین کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، بعض بالکلیہ جعلی کتابیں جو کسی قدیم مصنف کی طرف منسوب کردی گئی ہیں، مثلاً عبداللہ بن داؤد کی طرف منسوب کتاب "المصحف" زبیر بن بکار سے منسوب "کتاب نسب قریش" ابو علی سینا کی طرف منسوب "رسالہ حشر الاجساد" وغیرہ ان کے مقاصد کے لیے بڑی کارآمد ثابت ہوئی ہیں، بلاشبہ ممتون کتاب کی طباعت، اشاعت، فہرست سازی اور اشاریہ نویسی میں جو محنتیں انھوں نے کی ہیں وہ لائق صد آفریں ہیں، ان کی مساعی سے بہت سی نایاب قیمتی کتابیں ہمارے لیے قابل حصول ہوگئیں، لیکن ترجمہ و تحشیہ میں کبھی بالارادہ اپنے جذبۂ عداوت کے تحت اور کبھی محض اپنی جہالت سے عجب گل کھلائے ہیں، مثلاً مشہور مستشرق فلوگل نے ۱۸۴۲ء میں ایک وسیع لغت الفاظ قرآن مجید کا شائع کیا، اس لغت میں ۳۹...... الفاظ کے غلط عربی مادے لکھ دیئے اور نتیجۃً معانی بدل ڈالے، مثال کے لیے ان پانچ الفاظ کو دیکھیے۔

۱- اثرن کا مادہ "ا ث ر" قرار دیا ہے، حالانکہ اسکا صحیح مادہ فعل ث، و، ر ہے،

۲- المخاص کا مادہ "خ - و - ص" قرار دیا ہے، حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل م - خ - ص ہے،

۳- استبقوا کا مادہ "ب - ق - ی" قرار دیا ہے، حالانکہ صحیح مادہ فعل س - ب - ق ہے۔

۴- وقرن کا مادہ "ق - ر - ن" قرار دیا جب کہ صحیح مادہ فعل ق - ر - ر ہے،

۵- مقیلا کا مادہ "ق - و - ل" قرار دیا جب کہ صحیح مادہ فعل ق - ی - ل ہے،

اس تبدیلی سے معانی بالکل بدل گئے، یہ وہ مسٹر فلوگل ہیں جن کو مستشرقین کے نزدیک سند مستند کا مقام حاصل ہے۔

چونکہ ہمیشہ سے مسیحیت پر یہ اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ انجیل مقدس کے نام سے جو کتاب پیش کی جاتی ہے، وہ غلط اور فرضی ہے، اس میں ایک لفظ بھی وحی الٰہی کا نہیں، اس لیے مستشرقین نے اپنی تحقیقات کا سارا زور اس پر لگا دیا کہ قرآن مجید بھی اصلی اور قابل اعتماد نہیں، مثلاً گولڈ زیہر مذاہب التفسیر الاسلامی میں لکھتے ہیں کہ قرآن مجید ابتداءً لکھا گیا تو حروف پر نقطے نہیں تھے، اس لیے لوگوں نے نہ جانے کیا لکھا تھا اور کیا پڑھا، ان فاضل مستشرق نے کیا بات پیدا کی ہے، جس قوم میں مادر زاد اندھے حافظ رہے ہوں اور جس میں آج تک استاد سے شاگرد کی طرف علم کی منتقلی بذریعہ صوت ہو، اس میں نقطے کی کیا اہمیت ہے، بھلا صحابہؓ رسول اللہ ﷺ کی زبان اقدس سے آواز سنتے تھے، یا لکھی ہوئی تحریروں سے قرآن مجید یاد کرتے تھے، اور کیا آج تک کسی مسجد اور کسی مدرسہ میں قرآن مجید بغیر معلّم کی آواز کے بلیک بورڈ پر لکھ کر پڑھا جاتا ہے؟ قرآن مجید کی آواز، مد، سکون، وقف سکتہ یہ سب کچھ بذریعہ روایت محفوظ ہے، اس وقت نوشت و خواند اتنی عام کہاں تھی، یہی ہوتا تو حضرت ابن ام مکتومؓ نابینا صحابی نے قرآن مجید کیسے یاد کیا، اور ناحرف شناس تو بہت سے حافظ قرآن صحابہ میں موجود تھے، اسی طرح کی مہمل دلیلوں اور مغالطوں کے ذریعہ مستشرقین حضرات یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ توراۃ شریف اور انجیل مقدس کی طرح قرآن مجید بھی دنیا سے ناپید ہو گیا، اسی طرح وہ سیرۃ طیبہ، اسلامی تاریخ اور فقہ اسلامی میں طرح طرح کے شک پیدا کرنے کی کبھی بالارادہ کوشش کرتے ہیں

اور کبھی نقص مطالعہ اور غرور علم وفضل کی آمیزش سے ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں؛ ایک مستشرق لوئی دنڈرمین نے ایک علمی مجلس میں یہ اعتراض کیا کہ ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰ رضی کے گھر حضرت زبیرؓ اکثر جاتے تھے، اور کبھی کبھی وہیں سو بھی جاتے تھے، ام المومنین ان کے سر میں کنگھی بھی کر دیتی تھیں، حالانکہ اسلام میں کسی عورت کا غیر مرد سے اس طرح خلا ملا جائز نہیں ہے، اس اعتراض کے بعد جب انھیں بتایا گیا کہ حضرت ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰؓ حضرت زبیرؓ کی حقیقی پھوپھی تھیں، اور ان ہی نے بچپن سے ان کو پالا تھا تو نہایت معصومیت سے فرمایا "اچھا یہ بات ہوگی"۔

خلاصہ یہ ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو ہمیشہ ہی سے اسکا صدمہ رہا ہے کہ اسلام نے شام وعراق، مصر ومراکش وغیرہ میں کیوں قدم جما لیے اس کا انتقام لینے کے لیے انھوں نے تلوار کے ساتھ ساتھ قلم سے بھی کام لیا، اور کام لے رہے ہیں اور ہمیشہ کام لیتے رہیں گے، مسلمانوں کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، عیسائی مبلغین جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، کبھی وہ استعماری حکومتوں کے ہراول دستہ تھے، اور اب یورپین تہذیب وتمدن کے نقارچی ہیں جنھیں بیش قرار تنخواہیں سیاسی مصالح اور تجارتی مقاصد کی تکمیل کے لیے دی جاتی ہیں، یہ مبلغ بھی ہوتے ہیں ... فقیر بھی اور کبھی کبھی کوئی اور روپ دھار لیتے ہیں۔

وفیات

مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی

عربی زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مولانا عبدالعزیز میمنی کی وفات بڑی افسوسناک ہے، انھوں نے خاصی طویل عمر پائی، انتقال کے وقت ۹۰ برس کے تھے لیکن عربی علم وادب اور تاریخ وتحقیق کے میدان میں ان کا جو مرتبہ تھا، اس کی بنا پر درازیٔ عمر کے باوجود ان کا انتقال بہت محسوس ہوگا، اور عرصۂ دراز تک انھیں یاد کیا جاتا رہیگا۔

وہ ۱۸۸۸ء میں راجکوٹ (کاٹھیاواڑ) میں پیدا ہوئے، عنفوان شباب میں تحصیل علم کے لیے دہلی کا سفر کیا، اور وہاں ایک عرصہ تک تحصیل علم میں مشغول رہے، انھوں نے باقاعدہ کسی درسگاہ سے سند فراغ نہ لی تھی، لیکن اہل کمال کی خدمت میں رہ کر عربی ادب میں کمال پیدا کیا، شیخ طیب عرب سے مدتوں اکتساب فیض کیا، ڈپٹی نذیر احمد سے بھی کافی استفادہ کیا، مطالعۂ کتب کا خاص اہتمام تھا، اس طرح کامل دستگاہ حاصل کر لی اور اقران واماثل میں ممتاز سمجھے جانے لگے، تلاش معاش کے لیے پہلے اسلامیہ کالج پشاور پہونچے، وہاں عربی کے استاد کی حیثیت سے کچھ عرصہ تک درس وتدریس کی خدمت

انجام دی، اپریل ۱۹۲۱ء میں اورنٹیل کالج لاہور میں ایڈیشنل مولوی کی حیثیت سے ایک سو روپیہ ماہوار پر تقرر ہوا، یہاں کی علمی و ادبی فضا نے ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا، چنانچہ درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تحقیق کا ذوق پروان چڑھا چار سال بعد آخر ۱۹۲۵ء میں یہاں سے علی گڑھ چلے آئے، پہلے شعبۂ عربی میں استاد ہوئے، پھر صدر شعبہ ہو گئے، ۱۹۴۹ء میں یہاں سے ریٹائرڈ ہو کر کراچی چلے گئے، وہاں کراچی یونیورسٹی کے قیام پر شعبۂ عربی کے صدر منتخب ہوئے، یہاں سے سبکدوشی کے بعد اکتوبر ۱۹۵۴ء میں مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی کے پہلے اعزازی ڈائرکٹر مقرر ہوئے، یہاں مولانا کے فرائض میں ایک اعلیٰ درجہ کے کتب خانہ ..... کا انتظام تھا، اس غرض سے پاکستان کی وزارت تعلیمات نے ان کے لئے مختلف ممالک کے سفر کا انتظام کیا، تاکہ نادر و نایاب کتابیں فراہم ہو سکیں، مولانا نے اس علمی سفر میں مصر شام، تونس، الجزائر، سعودی عرب، عراق، ترکی، اور ہندوستان کا دورہ کیا، ان کی نظر انتخاب نے اس ادارہ کے کتب خانہ کو قیمتی کتابوں سے مالا مال کر دیا،

مولانا کا اوڑھنا، بچھونا عربی زبان و ادب کی خدمت تھا، اس سلسلہ میں انھوں نے ایسے نقوش جاوداں ثبت کیے ہیں، جو عرصہ تک ان کی یاد دلاتے رہیں گے، ان کا پہلا علمی و تحقیقی کارنامہ "ابو العلاء و ما الیہ" ہے، اس کتاب میں انھوں نے ادبائے شرق و غرب کے افکار و خیالات کا جائزہ لیا، اس کی اشاعت کے بعد ادبائے عرب اور مستشرقین یورپ نے ان کی دیدہ وری، شان تحقیق اور وسعت نظر کی دل کھول کر داد دی، علامہ سید سلیمان ندوی انکے علمی و تحقیقی کاموں کے بڑے قدر شناس تھے، انھوں نے اس تحقیقی شاہکار کو دار المصنفین کے سلسلۂ تصنیفات میں شامل کیا، اور ۱۳۴۴ھ میں بڑے اہتمام کے ساتھ اسے قاہرہ

میں طبع کرایا۔ اس کے شروع میں میمن صاحب نے دار المصنفین کی خدمات، سید صاحب کے علمی شغف اور علامہ شبلی کا ذکر خیر کیا ہے اور اس کتاب کو دار المصنفین کے سلسلۃ الذہب میں شامل کئے جانے پر شکر و امتنان کا اظہار کیا ہے، اس سے عالم اسلام میں دار المصنفین کی خدمات کا بھی تعارف ہوا، اس کتاب کی اشاعت پر سید صاحب بہت خوش ہوئے اور قارئین معارف کو اس علمی تحفہ کی خبر شذرات میں اس طرح دی۔

" دار المصنفین کی طرف سے ایک نئی عربی کتاب ابو العلاء معری پر جو عربی زبان کا خیام ہے، مصر کے مطبعہ سلفیہ سے چھپوا کر منگوائی گئی ہے، یہ ہندوستان کے مشہور فاضل و ادیب مولانا عبد العزیز صاحب میمن استاذ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تصنیف ہے، اب تک بلادِ عربیہ میں اس شاعر پر جو کچھ لکھا گیا تھا، اس سے بہت زیادہ بڑھکر اور ان سے زیادہ صحت اور استیعاب کے ساتھ اس کتاب میں معلومات فراہم کی گئی ہیں، لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ وسعتِ معلومات ایک طرف ایک ہندی نژاد کے عربی قلم نے خود اہل زبان سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔" (معارف جنوری ۱۹۲۴ء)

سید صاحب ان کے علمی و تحقیقی کام کے بڑے قدر داں تھے، ان سے مضامین طلب کرتے سید صاحب کی فرمائش پر انھوں نے معارف میں متعدد مضامین لکھے، جنھوں نے اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیا، پہلا مضمون جولائی ۱۹۲۴ء میں کتب خانۂ جامع القرویین فاس کے بارہ میں شایع ہوا، اس کے بعد اسی سال ابن رشیق اور المعز بن بادیس پر ایک مضمون نکلا، جس کے شروع میں سید صاحب کا ایک نوٹ بھی تھا۔

" مولانا نہ صرف عربی زبان و ادب پر کامل عبور رکھتے ہیں بلکہ علم کا خالص سنجیدہ اور ٹھوس مذاق رکھتے ہیں، جنکے قلم سے عربی ادبیات کی وسعت اطلاع کی متعدد

مثالیں ملک کے سامنے آچکی ہیں، ذیل کا مضمون تلاش کامل، مطالعۂ عمیق اور سخت کاوش و محنت کا نتیجہ ہے (معارف ۲۴ء)

اس کے بعد ۲۵ء میں "ابو العلاء اور معارضۂ قرآن"، "ابو تمام کی نقائض جریر و اخطل کا ایک واحد نسخہ" کے عنوان سے دو اور مضامین شایع ہوئے، "ابو العلاء معری اور گاندھی جی کا چرخہ" ایک مضمون لکھا۔ . . . . تو سید صاحب نے تحریر فرمایا کہ

"ہمارے دوست مولانا عبدالعزیز کو آجکل ایسی ہی دھن ہے جیسی گاندھی جی کو چرخہ کی، چنانچہ ابو العلاء معری کا چرخہ آج وہ نکال کر لائے ہیں"

سید صاحب نے ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم کی حیثیت سے ندوہ میں توسیعی خطبات کا سلسلہ شروع کرنے کا عزم کیا تو اس سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا عبدالعزیز میمن نے جون ۲۵ء میں طلبائے ندوہ کے سامنے ایک خطبہ دیا، سید صاحب کے ایک طویل نوٹ کے ساتھ ایک خطبۂ علمی "ابو العلاء معری کے متعلق مستشرقین یورپ کی غلطیاں" کے عنوان سے ستمبر، اکتوبر، نومبر ۲۵ء میں معارف میں شایع ہوا،

ان کے علاوہ قابل ذکر مضامین میں "علامہ ابن الجوزی کے افکار یا ان کا روزنامچہ" مئی ۲۸ء میں "ابن رشیق صقلیہ" میں جولائی ۲۹ء میں شایع ہوا،

میمن صاحب کا دوسرا اہم علمی کارنامہ امالی کی شرح سمط اللآلی کو ایڈٹ کرنا ہے یہ دو جلدوں میں قاہرہ سے شایع ہوئی، ایک جلد فہرست کی اس کے علاوہ تھی جس میں اماکن و امصار، اعلام و اشخاص کو حروف تہجی کے اعتبار سے تحریر کیا ہے، یہ فہرست بھی تلاش و تحقیق کرنے والوں کے لئے بڑی کارآمد ہے۔

ابوعلی القالی (متوفی ۳۵۶ھ) کی الامالی عربی ادب کی امہات کتب میں شمار

ہوتی ہے، مورخ ابن خلدون کا مقولہ ہے "جسے ادب عربی حاصل کرنا ہو، اسے اس فن کی ان چار اصل الاصول کتابوں کو یاد رکھنا چاہئے، (۱) البیان والتبیین للجاحظ (۲) الکامل للمبرد (۳) الامالی لابی علی القالی، (۴) ادب الکاتب لابن قتیبہ۔

ابو عبید البکری (متوفی ۴۸۷ھ) نے امالی کی ایک بلند پایہ شرح اللآلی کے نام سے لکھی، مولانا میمنی نے سات سال کی تلاش و تحقیق کے بعد اسے مرتب کیا، سمط اللآلی کے نام سے اس پر بڑا بیش قیمت حاشیہ لکھا، . . . ۱۹۳۶ء میں یہ کتاب مصر سے شایع ہوئی تو میمنی صاحب کا نام ساری دنیا میں پھیل گیا۔

مولانا محمد عبداللہ سورتی نے معارف ۳۸ء میں تین قسطوں میں اس پر تبصرہ کیا، اور غلطیوں کی نشان دہی کی، میمنی صاحب نے برہان ۳۸ء و ۳۹ء کے سات شماروں میں اس کا پرزور جواب لکھا، افسوس ہے کہ اس جواب میں شدت جذبات کی بنا پر علمی مباحث کے ساتھ نامناسب الفاظ میں سورتی صاحب کی ذات کو بھی ہدف طنز و تعریض بنایا ہے۔

الندوہ کے دور جدید میں "میری محسن کتابیں" ایک مفید سلسلہ شروع کیا گیا تھا جس میں مشاہیر اہل علم نے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کیا تھا اس میں مولانا میمن نے بھی اپنی محسن کتابوں کا ایک جائزہ پیش کیا ہے، جو اس کے مجموعہ "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" مرتبہ مولانا محمد عمران خان ندوی میں دیکھا جا سکتا ہے،

مولانا کو جاہلی اور اسلامی شعراء کے ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں اشعار ازبر تھے قدیم ادب پر بھی ان کی نظر بہت عمیق تھی، الفاظ کی تحقیق میں ان کو خاصا درک تھا، انساب بھی ان کا خاص موضوع رہا ہے، ہندوستان میں جب تک آپ کا قیام رہا علی گڈھ سے

تعلق کے ساتھ ہندوستان کے عربی مراکز اور اسلامی اداروں سے بھی گہرا ربط رہا، اور مختلف علمی و ادبی انجمنوں کے رکن رہے، عالم اسلام میں اپنی خدمات کی بنا پر انھیں بڑی شہرت حاصل تھی، ۱۹۲۸ء سے دمشق کی مشہور علمی اکیڈمی "المجمع العلمی" کے رکن منتخب ہوئے، اس کے ترجمان "المجلۃ العربی" میں آپ کے بہت سے مضامین شایع ہوئے، عربی کے سب سے اہم لغت لسان العرب کی اشاعت کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں بھی میمن صاحب کا نام شامل تھا، ان کی ان وقیع خدمات کے صلہ میں جامعۂ ازہر کی طرف سے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند دی گئی۔

آپ کی درج بالا کتابوں کے علاوہ دوسری قابل ذکر علمی و ادبی کتابیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ابن رشیق، ۲۔ نسب عدنان وقحطان، ۳ نظرۃ علمی دیوان نعمان بن بشیر الانصاری، ۴۔ ما اتفق لفظہ واختلف معناہ، ۵۔ النتف، ۶۔ الطرائف الادبیۃ، ۷۔ الکلید الخزانۃ۔ ۸۔ عرام بن الاصبغ السلمی الاعرابی کی، اسماء جبال تہامہ، ۹۔ زیادات المتنبی، ۱۰۔ ثلاث رسائل، ۱۱۔ المداخل، ۱۲۔ فرائد القصائد ۱۳۔ دیوان الشنفری، ۱۴۔ دیوان ابراہیم الصولی، ۱۵۔ دیوان حمید بن ثور ۱۶۔ الفاضل للمبرد، ۱۷۔ حواشی اللسان، ۱۸۔ اغلاط معجم الادبا یاقوت، ۱۹۔ خلاصۃ السیر۔ ۲۰۔ ابواب مختارہ، ۲۱۔ النفائث، ۲۲۔ اختیار الجرجانی، ۲۳۔ دیوان سحیم العبد، ۲۴ دیوان کعب، ۲۵۔ المقصور للفراء، ۲۶۔ التنبیہات وغیرہ وغیرہ،

"م، ن، ن"

مطبوعات جدیدہ

الی الاسلام: از جناب وحیدالدین خاں صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۰۴ مجلد قیمت: ۱۵ روپیہ، پتہ: رسالہ بک ڈپو، ۳۰۴۰، اکشن گنج، دہلی ۶۔

اس کتاب میں دین کے بعض پہلوؤں کی تشریح اور دعوت دین کے اصول اور طریقے بیان کئے گئے ہیں، دین کی حقیقت کے سلسلہ میں عبادت کا مطلب اس کے تقاضے، مظاہر نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کی روح، اور صراط مستقیم کی اہمیت و حقیقت کا ذکر ہے، مصنف نے اسوۂ نبوی اور سیرت رسولؐ بیان کر کے اس کے آئینہ میں دعوت دین کے آداب بتائے ہیں، اور دکھایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز و اختتام کس طرح کیا اور اس سلسلہ میں پیش آنے والے مصائب و مواقع میں کیا رویہ اور حکمت عملی اختیار فرمائی، دعوت الی اللہ کی اہمیت و فرضیت اور مضمون دعوت کی وضاحت بھی کی ہے، اور اس کے لئے موجودہ معیار کے مطابق ایک اہم دعوتی مرکز کی ضرورت بھی بیان کی ہے، ان کے خیال میں اس کا قیام موجودہ مسلم حکومتوں کے وسیع ذرائع اور مالی وسائل کی بنا پر بہت آسان ہے، ایک مضمون میں ملت کی تعمیر و استحکام کے ضروری اور اہم خطوط کا ذکر ہے، ایک اور مضمون میں اس زمانہ کی اسلامی تحریکوں اور دینی دعوتوں کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے، اور ان کے طریقہ دعوت کی خامیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، آخر میں مختلف مضامین دے کر ثابت کیا ہے، کہ اس دور میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی قبولیت اور اس کی جانب میلان کے گوناگوں امکانات پیدا ہو گئے ہیں بشرطیکہ ... مناسب ڈھنگ، جدید طرز استدلال اور موجودہ علمی معیار کے مطابق اس کو پیش کیا جائے اور

جن لوگوں میں کام کرنا ہو ان کی زبان اور ان کے علوم و مذاہب سے گہری واقفیت حاصل کی جائے، اور مخاطب کے ذہنی پس منظر کو مد نظر رکھا جائے، یہ کتاب مصنف کی متکلمانہ تعبیر کا نمونہ ہے، مگر ان کا ادعائی رنگ، بے لچک انداز، انتہا پسندی اور جارحانہ تنقید کھٹکتی ہے، وہ مختلف پہلوؤں اور گوشوں سے صرف نظر کر کے کسی ایک رُخ یا چند پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نتائج نکالنے لگتے ہیں، اس بنا پر ان کے بعض خیالات و نتائج میں شدت پسندی اور عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے، جیسے عربی مدارس کا صرف یہ نقص بتایا ہے کہ "ان کا رشتہ اقتصادیات سے ٹوٹ گیا"، اور اس کا حل یہ تجویز کیا ہے کہ "یونیورسٹی سے الحاق" وہ عربی مدارس، دینی جماعتوں اور خانقاہوں کو بالکل افادیت سے خالی، قطعی ناکام اور بے معنی قرار دیتے ہیں، اور ان کی واقعی خوبیوں سے قطع نظر کر لیتے ہیں، اور یہ بھول جاتے ہیں کہ دین بھلے برے جس حال میں ہے انہی کی بدولت ہے، باطنی کیفیت اور اصلی روح سے خالی نمازوں کو "کرتب" اور "کمپیوٹر کی نماز" کہنا بھی ان کی انتہا پسندی اور جسارت ہے، ان کی بعض تحریروں سے خود ستائی نمایاں ہے انھوں نے جدید علمی معیار اور سائنٹفک طرز استدلال پر بڑا زور دیا ہے، مگر کیا اس کتاب کا "حرف آخر" اس انداز کا حامل ہے، ان کے شگفتہ و سلاست نگار قلم سے یہ جملہ دیکھ کر حیرت ہوئی "آپ مع پریوار اس میں شرکت فرمائیں"، کہیں کہیں حوالے بھی درج نہیں ہیں،

تقویم تاریخی: مرتبہ:- مولانا عبد القدوس ہاشمی تقطیع کلاں،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۵۲- مجلد، قیمت آٹھ روپیے،

پتہ:- ادارۂ تحقیقات اسلامی، کراچی، پاکستان،

مولانا عبد القدوس ہاشمی پاکستان کے معروف اہل علم ہیں ان کا مطالعہ وسیع اور موضوعات بحث متنوع ہیں، کچھ عرصہ ہوا انھوں نے ہجری، عیسوی سنین کی تقابلی تقویم لکھی ہے، جو ۱ھ سے ۱۵۰۰ھ تک کی تاریخوں پر مشتمل ہے، اس موضوع پر پہلے بھی کچھ کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن ہاشمی صاحب

تقویم سہل المراجعت ہے، اس کے علاوہ اس میں مشہور واقعات و حوادث کے سنین کی تصریح مشاہیر اسلام کی تاریخ وفات بھی دی گئی ہے، مصنف نے ہر سال کا جدول چار خانوں میں دیا ہے پہلے خانے میں عربی مہینوں کے نام درج ہیں، دوسرے میں ہر عربی مہینہ کی پہلی تاریخ کے دنوں کے نام اور تیسرے میں انگریزی تاریخیں لکھی گئی ہیں، چوتھے خانے میں مشہور واقعات و حوادث مذکور ہیں، اس طرح اس تقویم سے صحیح ہجری و عیسوی تاریخوں اور دنوں کے علاوہ امت کے مختلف طبقوں کے ممتاز اشخاص کی وفات، بادشاہوں کی تخت نشینی، مشہور غزوات و محاربات اور اہم شہروں اور عمارتوں کی تعمیر کے سال اور مہینے معلوم ہو جاتے ہیں، لیکن اندراج میں کہیں کہیں سہو قلم بھی ہو گیا ہے، مثلاً "مولانا ابو الکلام آزاد کی"، وفات اگست ۱۹۵۸ء اور مولانا شبلی مرحوم کی اکتوبر ۱۹۱۴ء کے خانے میں درج ہو گئی ہے، حالانکہ اول الذکر کا فروری میں اور آخر الذکر کا نومبر میں انتقال ہوا تھا، ممکن ہے اس طرح کی بعض اور فروگذاشتیں بھی ہوں، لیکن ان سے کتاب کی قدر و قیمت میں کمی نہیں آتی، علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو اس سے بڑی مدد ملے گی، شروع میں آنحضرت صلعم کی ولادت سے ہجرت تک کے ۵۳ برسوں کے اہم واقعات کی تاریخوں کا اجمالی نقشہ بھی دے دیا ہے، اور "داستان ماہ و سال" کے عنوان سے ایک مختصر مگر مفید مقدمہ بھی ہے یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں چھپی تھی، لیکن پاکستان سے مراسلت بند تھی، اس لئے معارف میں تبصرہ کے لئے بہت تاخیر سے آئی،

علم قراءت اور قراء سبعہ: مرتبہ قاری ابو الحسن اعظمی صاحب، کاغذ،

کتابت و طباعت بہتر، صفحات: ۱۸۴، قیمت: ۶ روپے، پتے:- (۱) مدرسہ اصغریہ دیوبند، (۲) مکتبہ نعمانیہ، دیوبند، یوپی

اردو میں فن قراءت پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، اس نئی کتاب میں قراءت کے اصول و مبادی، قراء سبعہ اور ان کے مشہور رواۃ کے حالات درج ہیں، آخر میں اس فن

کی اہم کتابوں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، مصنف نے اس مشہور حدیث پر طویل گفتگو کی ہے، جس میں قرآن کے سات حرفوں پر نازل کئے جانے کا ذکر ہے، مگر کوئی فیصلہ کن بات سامنے نہیں آسکی، یہ معاملہ ہے بھی بڑا مشکل اور بڑے بڑے ائمۂ فن اس حدیث کی تشریح میں دشواری محسوس کرتے ہیں، اس کتاب میں ترتیب و تالیف اور طرز ادا وغیرہ کی بعض خامیاں ہیں، بعض عبارتیں عسیر الفہم ہیں، بعض کتابوں اور اشخاص کے نام اس قدر اختصار سے لکھے گئے ہیں کہ آسانی سے ان کی طرف ذہن منتقل نہیں ہو سکتا، اگر تمام اصطلاحی الفاظ کی وضاحت کردی گئی ہوتی تو کتاب اور مفید ہوجاتی، کہیں کہیں حوالے بھی درج نہیں ہیں، تعدد اقوال کی صورت میں مشہور و مرجح اقوال ہی کے نقل کرنے پر اکتفا نہیں کی گئی ہے، بلکہ ہر قسم کی رطب و یابس باتیں نقل کردی ہیں، بعض تفسیری اقوال کو اختلاف قرأت پر محمول کیا گیا ہے، قرأت لغت اور ادب کے مشہور امام ابوعبید قاسم بن سلام کے متعلق کئی جگہ لکھا ہے، کہ سنہ وفات نہیں معلوم ہو سکا، حالانکہ کسی بھی فہرست اور تذکرہ سے اسے معلوم کیا جاسکتا تھا، ان کی وفات ۲۲۴ھ میں ہوئی تھی، قرأت کی اردو کتابوں کے ضمن میں ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی حیدرآبادی اور مولانا قاری حافظ محمد حبیب اللہ خاں کراچی کی کتابوں کا کوئی ذکر نہیں ہے،

متعلقات غالب، جناب کالیداس رضا گپتا، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت، و طباعت عمدہ، صفحات: ۱۷۴، مجلد قیمت ۲۰ روپیہ، پتہ: دین پبلیکیشنز، ۱۰۷، موتی بھون، نیو میرین، لائنز، چرچ گیٹ، بمبئی،

جناب کالی داس رضا گپتا کامیاب تاجر ہی نہیں اردو کے ادیب اور خدمت گذار بھی ہیں، اردو زبان و ادب سے ان کا شغف عشق کی حد پہنچ گیا ہے، بمبئی کے ہنگامہ خیز ماحول اور کاروباری مصروفیت کے باوجود وہ شعر و سخن اور علم و ادب کی بزم آرائی کی بھی فکر رکھتے ہیں، غالبیات سے اُن کو زیادہ دلچسپی ہے، زیر نظر کتاب اُن کے

چند مضامین پر مشتمل ہے، پہلے مضمون "غزل قدسی اور تضمین غالب" میں شاہجہانی دربار کے ملک الشعرا قدسی کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سید کی مدنی العربی" پر کئی ہندوستانی شعرا کی تضامین کے بعض مجموعوں کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں تضامین کے اولین مرتب کی تشنہ ذہنی اور بعد کے مرتبین کی ادبی خیانتوں کا ذکر ہے، یہ مضمون تقریباً دو سال پہلے معارف میں چھپا تھا، ڈاکٹر سمیع الدین احمد لکچرر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے معارف ہی میں اس کا تعاقب کیا تھا، جس کا رضا صاحب نے پھر معارف میں جواب دیا تھا، اس جواب کا خلاصہ اور نعت قدسی پر غالب کی تضمین بھی بطور ضمیمہ اصل مضمون کے بعد شامل ہیں، دوسرے مضمون میں حضرت علیؓ سے منسوب "دعائے صباح" کا عربی متن اور اس کا نثر و نظم میں ترجمہ درج ہے، لائق مرتب کے خیال میں ترجمۂ نثر کی غالب کی جانب نسبت صحیح نہیں ہے، غالب کی دعائے صباح کے ناشر مرزا عباس بیگ اور ان کے چچا مرزا افضل بیگ کے حالات بہت کد و کاش سے لکھے گئے ہیں، اول الذکر غالب کے بھانجے اور موخر الذکر ان کے بہنوئی مرزا اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی تھے، ایک مضمون میں غالب کے شاگرد میاں داد سیاح کے حالات اور ۳ غزلیں درج ہیں، جو گلدستۂ سخن سے ماخوذ ہیں، اس میں مکاتیب غالب سیاح اور میر با غلام خاں کے نام کے خطوط ان کے چند مطبوعہ اور ۲ غیر مطبوعہ قطعات تاریخ بھی درج ہیں، آخری مضمون میں غالب کے نامور شاگرد ذکا کے مختصر حالات، ان کے اردو دیوانوں کے بارہ میں مفصل معلومات درج ہیں، اور کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے، سلسلۂ غالبیات کی یہ ایک مفید کڑی ہے، لائق مرتب نے پہلے مضمون میں ایک جگہ رسالہ آج کل دہلی کے ایک مضمون نگار رسید وزیر الحسن سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، یہی بات ان کی بعض آراء کے بارہ میں کہی جاسکتی ہے، لائق مرتب کے بعض خیالات کے بارے میں ماہرین غالبیات کی رایوں کا انتظار کرنا پڑے گا،

آئینۂ وطن: از جناب ضیا راہی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۱۲ مجلد مع گرد پوش قیمت عہ روپئے (۱)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی (۲) نقش کوکن پبلی کیشنز ٹرسٹ ۹۳ جیل روڈ ڈونگری (الیسٹ)، بمبئی۔ ۹

یہ جناب ضیا راہی (بھیونڈی، بمبئی) کی قومی و وطنی نظموں کا مجموعہ ہے، اس میں ملک کی شان و شوکت یہاں کی قدیم پرشکوہ عمارتوں کے حسن و دلفریبی، مختلف مذہبوں کے بزرگوں اور سنتوں کی عظمت و برتری، مشہور قومی رہنماؤں، اردو کے نامور شاعروں اور ادیبوں کے فضل و کمال کا ذکر ہے، شاعر نے اتحاد، یکجہتی، اور میل جول کا درس بھی دیا ہے، اور فسادات، فرقہ واریت اور اخلاقی پستی کی مذمت بھی کی ہے، ضیا، صاحب کا کلام فنی حیثیت سے چاہے زیادہ بلند نہ ہو، لیکن ان کے خیالات اور جذبات قابل قدر ہیں۔

الفرقان وفیات نمبر: ماہنامہ الفرقان لکھنؤ ۴۴ سال سے مولانا محمد منظور نعمانی کی ادارت میں دین و ادب کی اہم خدمات انجام دے رہا ہے، اس طویل مدت میں اکابر ملت کے حادثۂ ارتحال پر بہت مضامین شائع ہوئے، پیش نظر نمبر میں انھیں یکجا کر دیا گیا ہے، اس میں علماء میں مفتی کفایت اللہ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا اعزاز علی، مولانا مناظر احسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبد الشکور فاروقی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا بدر عالم، مولانا محمد یوسف، مولانا احتشام الحسن، مولانا ابراہیم بلیاوی وغیرہ کی خدمات بیان کی گئی ہیں، ارباب طریقت میں مولانا اشرف علی، شاہ وصی اللہ، شاہ محمد یعقوب مجددی، حضرت رائے پوری، مولانا محمد الیاس کے کمالات و خصوصیات کو مولانا نعمانی کے قلم نے نمایاں کیا ہے، اطباء میں ڈاکٹر عبد العلی، حکیم عبد السعید، حکیم عبد اللطیف کے سوانح حیات اور ذاتی تاثرات قلمبند کیے گئے ہیں، یہ نمبر مکتبہ الفرقان لکھنؤ سے پانچ روپئے میں مل سکے گا۔ "ض"